کے پھول

حُسنیٰ سَروَر کے ۱۴ افسانے

بَرف کے پھُول

PAGES 128 BARF KE PHOOL (SHORT STORIES)
BY HUSNA SARWAR 40.00 1989

(افسانے)

حسنی سرور

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۵ ڈ ب زائر ساتواں کراس
شیواجی روڈ۔ این۔ آر محلہ۔ میسور
۵۷۰۰۰۷

اشاعت : ـــــــ ۱۹۸۹ء

قیمت : ـــــــ چالیس روپے

کتابت : ـــــــ راحت علی خاں

طباعت : ـــــــ اے ون آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی ۲

سرورق : ـــــــ رزاق ارشد

زیرِ اہتمام:
پریم گوپال متل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

عزیز قارئین کے نام

——— جو میرے ادبی سفر
کے آغاز ہی سے میری پذیرائی
کرتے رہے ہیں
——— اور
اِن افسانوں کے اُن جیتے جاگتے کردارو ں
کے نام بھی
جو معاشرے اور ماحول کے پردوں سے
جھانک جھانک کر مجھے مجبور کرتے ہیں کہ
——— ہمیں لکھو!

فہرست

حسنیٰ سرور

ولادت : ــــــ جون ۱۹۳۹ء

وطن : ــــــ ہاسن ۔ کرناٹک

ابتدائے نگارش :ــ ۴۶-۱۹۴۷ء (آٹھ نو سال کی عمر سے : تقریباً)

مطبوعہ تصانیف :ــــــ

خواب زار	(شعری مجموعہ)	۱۹۶۸ء
خواب زار	(دوسرا ایڈیشن)	۱۹۷۲ء
سیما	(ناول)	۱۹۶۸ء
اِک چاند چمکتا ہے	(شعری مجموعہ)	۱۹۷۶ء
شبنم شبنم	(شعری مجموعہ)	۱۹۸۶ء
برف کے پھول	(افسانے)	۱۹۸۹ء

غیر مطبوعہ تصانیف :—

سلیم (ناول) —
اے غمِ یار (ناول) —
نعت وسلام (شعری مجموعہ) —
رِم جھم رِم جھم ساون برسے (گیت اور بھجنوں کا مجموعہ) —

— اور —

ایک ناولٹ

سرگرمیاں —

رکن انجمن ترقی اردو، شاخ میسور
رکن اُردو جرنلسٹز اینڈ رائٹرز ایسوسی ایشن میسور
رکن الحسنات اُردو اکادمی۔ بنگلور
(کرناٹک اُردو اکادمی کی بھی تین بار رکن رہ چکی ہیں)

ایوارڈز —

کرناٹک سرکار کا سب سے اہم "راجیہ التسواد" ایوارڈ : نومبر ۱۹۸۷ء۔
کرناٹک اردو اکادمی ایوارڈ برائے اعلیٰ تصنیف شبنم شبنم پر۔ ۱۹۸۸ء
غالب کلچرل اکیڈمی بنگلور کا غالب ایوارڈ — ۱۹۸۹ء

پیش لفظ

اردو افسانے کا آغاز پریم چند سے مانا جاتا ہے حالاں کہ یہ صنف اُن سے پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ افسانے کے فنی تقاضوں کا احساس و ادراک اور ان کی پاسداری کی باقاعدہ روایت پریم چند سے شروع ہوئی اور یہ بات درست بھی ہے۔ پریم چند کی روایت کو اُن کے بہت سے پیروکاروں نے جن میں اعظم کریوی اور علی عباس حسینی جیسے ادیبوں کے نام شامل ہیں، آگے بڑھایا اور ترقی پسند افسانہ نگاروں نے بھی خود کو ان کا معنوی وارث قرار دیا۔ پریم چند سے ترقی پسندوں تک افسانے کا تانا بانا زندگی میں پیش آنے والے خارجی واقعات اور حادثات سے بُنا جاتا رہا ہے۔ افسانہ محض بیانِ واقعات سے عبارت نہ تھا۔ پریم چند اور ان کے پیروکار افسانے سے سماجی اصلاح کا کام بھی لینا چاہتے تھے۔ اُن کا یہ اصلاحی نقطۂ نظر ان کے افسانوں میں

جگہ جگہ در آتا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگار ایک انقلابی اندازِ فکر رکھتے تھے اور بُرے پہلوؤں کی اصلاح کے بجائے سماج کی مکمّل تبدیلی پر زور دیتے تھے جس کا حتمی نسخہ ان کے نزدیک اشتراکیت تھی۔

لیکن ان دو میلانات کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا میلان بھی تھا۔ اس میلان کے نمائندہ افسانہ نگار افسانے کو نہ تو محض بیانِ واقعات تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ نہ وہ اسے سماجی اصلاح یا انقلاب کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ ان کا زور کردار نگاری پر تھا جس کے وسیلے سے وہ انسان کی داخلی دُنیا میں جنم لینے والی کہانیاں سُنانا چاہتے تھے۔ انسان کے اندر جو کہانیاں جنم لیتی ہیں، ان کے محرّکات بھی خارج میں موجود ہوتے ہیں اس لیے یہ کہانیاں جہاں ایک طرف کسی کردار کے باطن سے قاری کو آشنا کرنے والی ہیں وہیں اس کے گرد و پیش سے بھی اسے متعارف کرا دیتی ہیں۔ اِس ذیل میں غلام عبّاس، منٹو اور کچھ دوسرے افسانہ نگاروں کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھیں جدید افسانے کا پیش رو بھی سمجھا جاتا ہے۔

لیکن جدید افسانہ دھیرے دھیرے خارج سے اپنا رشتہ مکمّل طور پر قطع کرتا گیا اور اس طرح اس نے ایک ایسی پیچیدہ CASE HISTORY کی شکل اختیار کر لی جسے ماہرین کی مدد کے بغیر سلجھایا نہ جا سکے۔ افسانے سے پلاٹ، کردار، مکالمہ سبھی نکال باہر کیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ افسانہ چند مبہم جو ناقدینِ ادب کی دل چسپی کا سامان بن کر رہ گیا اور عام قاری اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس صورتِ حال سے یہ ناقدینِ ادب تو بہت خوش تھے کہ اب افسانہ ان کی عالمانہ موشگافیوں کی بیساکھیاں لگا کر ہی عام قاری تک پہنچ سکتا تھا لیکن ایک مرحلے پر خود افسانہ نگاروں نے محسوس کیا کہ یہ بیساکھیاں بھی بیکار ہو چلی ہیں۔ اور جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اُسے تنقیدی پشت پناہی کے باوجود کوئی پڑھنے کو تیار نہیں۔ یہ احساس افسانے کے حق میں ایک نیک فال تھا اور اس کے نتیجے میں افسانہ اب پھر اپنے گم شدہ فنّی خدّ و خال حاصل کرنے لگا ہے۔

ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ اس بے رہ روی کے شکار زیادہ تر مرد افسانہ نگار ہوئے اور خاتون افسانہ نگاروں نے اس کی گرد بھی اپنے دامن پر نہ پڑنے دی۔ قرۃ العین حیدر

کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ کہانی میں شعوری ترتیب و تنظیم کی قائل نہیں لیکن یہ محض الزام ہے۔ بکھراؤ اور انتشار کی ایک زیریں لہر کے باوجود ان کی کہانیاں فنی نظم و ضبط کا بہترین نمونہ ہیں اور کردار نگاری کے علاوہ سماجی فضا آفرینی کا عمل بھی اُن کے ہاں اپنی اعلیٰ ترین شکل میں نظر آتا ہے۔ دل چسپی کا عنصر بھی جو افسانے کا بنیادی جوہر ہے، ان کے تجزیاتی اور مطالعاتی اندازِ نظر کے باوجود کہیں زائل نہیں ہوتا۔ دوسری خاتون افسانہ نگاروں نے بھی افسانے کے اصل خدوخال کو دُھندلا ہونے سے بچایا ہے اور الجھی ہوئی سے الجھی ہوئی "آپ بیتی" میں بھی "جگ بیتی" کا وہ رنگ بھرا ہے جو کسی واردات یا واقعے کو کہانی کا روپ دینے کے لیے ضروری ہے۔

حسنیٰ سرور ایک معروف خاتون افسانہ نگار ہیں۔ مجھ سے اور میری طرح شاید پوری اُردو دُنیا سے اُن کے اولین تعارف کا ذریعہ ان کی شاعری بنی تھی جس کی آڑ میں ایک جذباتی حساس مگر شائستہ اور مہذب نسائی کردار جلوہ گر تھا۔ اس کردار کے کچھ معصومانہ خواب تھے: خوب صورت زندگی کے خواب جو ناتجربہ کاری کی خوش نما سنہری دُھند میں لپٹے ہوئے نظر آتے تھے ـــــــ پھر وہ شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئیں اور جلد ہی اس صنفِ ادب میں بھی انھوں نے اپنی پہچان قائم کر لی۔

حسنیٰ سرور کی شاعری کی طرح میں ان کے افسانوں کا بھی قاری رہا ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اندازِ نظر میں گہرائی اور گیرائی بڑھی ہے۔ رومانی دھندلکوں سے نکل کر انھوں نے حقیقت کی چلچلاتی دھوپ سے آنکھیں چار کی ہیں، زندگی کی لطافتوں کے علاوہ زندگی کی کثافتوں کو بھی لکھنے کی ہمت کی ہے اور اس لیے اب ان کے مشاہدات جب کاغذ پر منتقل ہوئے ہیں، خواہ شاعری کے روپ میں، خواہ افسانے کی شکل میں، تو یہ ان کے مشاہدات نہ رہ کر ہم سب کے مشاہدات بن جاتے ہیں اور ہمیں ایک ایسی دُنیا کی سیر کراتے ہیں جو ہماری دیکھی بھالی 'جانی پہچانی دُنیا ہے مگر ہمیں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ جس نظر سے ہم اس دُنیا کو آج دیکھ رہے ہیں، شاید اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا اور یہ نئی نظر ہمیں حسنیٰ سرور نے دی ہے۔ میرے نزدیک ایک اچھے تخلیقی فن پارے کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔

اس مجموعے میں حسنیٰ سرور کے جو افسانے شامل ہیں انھیں فنّی لحاظ سے تو ہم سطح نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً "ریت کی دیواریں" اور "لال ساڑی" کو تقابل کی میزان میں رکھا جائے تو سارا جھکاؤ "ریت کی دیواریں" والے پلڑے کی طرف ہوگا، لیکن ایک چیز ان میں مشترک ہے: ایسے موضوعات کا انتخاب جو حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، ایسی زندگی جسے کہیں نہ کہیں جیا جا رہا ہے اور جس کے نشیب و فراز سے جنم لینے والے واقعات ہمیں اپنی طرف فوراً ہی متوجہ کر لیتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے کہا، حسنیٰ سرور حالات و واقعات کو حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کرنے کا ہُنر سیکھ چکی ہیں لیکن انسانی رشتوں کا ذکر ہو تو ان کا لہجہ اب بھی جذباتی ہو جاتا ہے۔ اسے ان کے اسلوب کی پہچان بھی کہا جا سکتا ہے لیکن اگر وہ اس پر زیادہ اصرار نہ کریں تو شاید فنّی احتساب کے تقاضوں سے زیادہ کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔

——— مخمور سعیدی

دہلی،
۲، اکتوبر ۸۹ء

"..... میرا تخلیقی سفر عموماً خواب زار سے ماحول میں طے ہوتا ہے۔
جہاں اِک چاند چمکتا ہو، ستاروں کے قافلے پلکیں جھپکاتے ہوئے آسمان
کی وسعتوں میں سفر طے کر رہے ہوں۔ اداس چاندنی ماحول کو شبنم
بنائے ہوئے ہو، احساس جاگ رہا ہو، جذبات سلگ رہے ہوں، شعور
بیدار ہو، تب ہی تو تخلیق کا کرب پیدا ہوتا ہے۔"

حسنیٰ سرور

گُھُٹ ہونے تک

اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں عجیب سی اُداسی تھی۔ نامعلوم ساخوف اور دہشت سی بیں جب اسے دیکھتی، جانے کیوں دل کھنچا جاتا۔ دیکھوں۔ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے۔ اتنی معصوم اور پیاری شکل تھی کہ میرے دل کے آئینے میں اُتر آئی تھی۔ بُوٹا سا قد۔ گندمی رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ ننھا سا دہانہ اور گھنگھریالے بالوں کا بکھرا بکھرا سا بوجھ گردن پر لیے وہ ایک کم عمر نادان سی لڑکی تھی۔ کبھی کبھار کمپونڈ کے پاس نظر آتی۔ ایک منظر۔ ایک جھلک دکھا کر تیزی سے اندر چلی جاتی اور دروازہ بند ہو جاتا!! وہ حال ہی میں ہمارے سامنے والے مکان میں آئی تھی۔ میں حیران تھی کیا اس کے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا؟ سوا اس نوجوان کے جو صبح گھر سے نکلتا ہے تو رات گئے واپس آتا ہے۔ کون ہے یہ نوجوان؟ بھائی یا کوئی رشتہ دار۔؟ اور وہ ننھی سی لڑکی دن بھر گھر میں کیوں قید رہتی ہے؟ ایسا لگتا ہے کوئی ننھی سی سبز پری کسی دیو یا جن کی قید میں ہو۔

سہمی سہمی۔ ڈری ڈری سی۔ جانے کون ہے وہ؟

پھر ایک صبح غل غپاڑے نے مجھے وقت سے پہلے جگا دیا۔ سامنے والے مکان میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ ایک مرد کی آواز تھی دوسری کسی عورت کی۔ یہ آواز اس لڑکی کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کوئی پختہ عمر کی عورت تھی جو چلا رہی تھی۔

میں نے اپنا دھیان دوسری طرف ڈال دیا۔ دیر تک آوازیں کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ اپنے کام میں مشغول رہ کر بھی میرا خیال اُدھر ہی مڑ جاتا۔ اور میں سوچنے لگتی۔ یہ کون جھگڑ رہا ہے؟ کیوں!!!

دوپہر ڈھلے میں اپنے صحن میں پودوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کی مضبوط بدن والی عورت میرے پاس چلی آئی۔

"نمستے جی"۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔" میں رادھا کی ماں ہوں جی! رادھا سامنے رہتی ہے نا"۔ وہ خود ہی بولی۔" اچھا۔ اچھا"۔

"ہاں بی بی جی! وہ میری بچی ہے۔ مردار زندہ ہے۔ مر نہ گئی۔ ہاسٹل میں پڑھنے کو رکھا تھا۔ مگر یہ کھیل کھیلا ہے اس نے۔ اپنی پسند سے اس لڑکے کے ساتھ بھاگ آئی ہے کہتی ہے کہ شادی کر چکی ہوں۔ سن کر دوڑی آئی۔ آخر اپنا خون ہے کیسے اس کی بربادی دیکھتی۔ سمجھا بجھا کر واپس لے جانا چاہتی ہوں مگر وہ ساتھ چلنا نہیں چاہتی۔ کم بخت! اور وہ ظالم کمینہ مجھ سے ہی لڑنے لگا"۔ عورت منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ میں یہ کہانی سن کر حیران رہ گئی۔ اتنی کم سن اور یہ کرتوت! مجھے اس عورت پر رحم آنے لگا۔

"مت رو بہن! آخر تمھاری اولاد ہے ایک دن سنبھل جائے گی۔ تم اسے نرمی سے سمجھا کر لے جاؤ"۔

"دونوں نے دھکے دے کر مجھے گھر سے نکالا ہے بی بی! کاش۔ میں یہ دن نہ دیکھتی۔ بھگوان کسی کو ایسی اولاد نہ دے۔ میں بھی دیکھتی ہوں وہ کیا کرتا ہے۔ کیسے نہیں بھیجتا میری بچی کو۔ لچا۔ میں اسے جیل بھجوا دوں گی۔ ہاں! وہ روتی بکتی چلی گئی۔

اور میرے دل میں رادھا کے لیے نفرت کا زہر گھل گیا۔ اس معصوم پیاری سی شکل کے اندر اتنا مکروہ چہرہ۔ کیا وہ اتنی گری ہوئی لڑکی ہے جو ماں کو ٹھکرا ایک غیر مرد کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہی ہے۔!

لیکن۔ ان خاموش نگاہوں میں وہ اداس سی مدھم سی کیفیت کیسی ہے؟ ایک خوف سا؛ ایک دہشت سی کیسی ہے؟!!!

منّی کا گیند رادھا کے کمپونڈ میں جا گرا تھا۔ وہ لینے کے لیے دوڑی تو میں نے سختی سے ڈانٹ دیا۔" منّی ادھر مت جاؤ"۔

"ممّی میرا بال"۔ وہ رونے لگی۔" کوئی بات نہیں دوسرا لے لینا"۔ اور یہ دیکھ کر مجھے غصہ آگیا کہ رادھا منّی کا بال ہاتھ میں لیے گیٹ پر کھڑی اسے بلا رہی ہے۔" بے بی۔ اپنا بال لے جاؤ" میٹھی سی پرکشش آواز تھی وہ۔ منّی نے خوفزدہ ہو کر مجھے دیکھا۔" نہیں۔!" میری آواز میں سختی تھی۔

وہ سہم گئی۔ اور میرے پیچھے چھپ گئی۔" بے بی اپنا بال لے لو،" اس کے ہونٹوں پر ایک ننھا سا تبسم تھا اور جانے کیوں میں اسے جھڑک نہ سکی۔ چپکے سے کہہ دیا۔"ادھر پھینک دو۔" میری نگاہیں غیر ارادی طور پر اس سے مل گئیں۔ وہ مسکرائی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس میں اپنائیت کا بر تو ہوتا ہے۔ میرا دل پل بھر کو کھنچ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے نفرت کی ایک تند لہر اٹھی۔ اور دل ڈوب ڈوب گیا۔ میں کچھ کہے بنا اندر مڑ گئی۔ اور منی کو منع کر دیا کہ ادھر جایا نہیں کرتے۔ دوسری مرتبہ پھر سے رادھا کی ماں آئی تو خوب خوب لڑائی ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ برآمدے میں رادھا کھڑی رو رہی ہے

"ماں! تم چلی جاؤ۔ ماں بھگوان کے لیے چلی جاؤ۔ کیوں میرے پیچھے پڑی ہو۔ میرا جیون کیوں برباد کرتی ہو ماں!۔"

"نہیں۔ تجھے بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ ورنہ میں پولیس کو خبر دیتی ہوں۔ چل میرے ساتھ۔" وہ رادھا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔

"نہیں۔ نہیں ماں۔ تم میرا بیوپار مت کرو۔ اس سے پہلے میرا گلا گھونٹ دو۔ تم۔ تم کیسی ماں ہو۔"

اسی لمحے رادھا کا ساتھی بھی آگیا۔ اور خوب گالی گلوچ ہوئی۔ رادھا کی ماں روتی چلاتی باہر نکل گئی۔

میں حیران ہوتی رہی کہ آخر یہ کیا قصہ ہے ماں بیٹی کا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے دروازے پر رادھا کھڑی تھی۔ تھر تھر کانپتی ہوئی۔ شمع کی لو کی طرح زرد۔ زار زار روتی ہوئی۔

میرا دل پسیج گیا۔" کیا بات ہے رادھا، یہ جھگڑا کیا تھا؟" وہ سسکنے لگی۔" آنٹی راکیش ابھی باہر گیا ہے۔ اس کے آنے تک مجھے یہاں رہنے دو۔ میں سب باتیں بتادوں گی۔ آپ مجھے بچالو۔ آنٹی!۔"

"چلو اندر چلو۔ بیٹھو گھبراؤ نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ وہ ذرا سنبھلی تو پوچھا۔" تم اپنی ماں کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں یہ روز روز کے جھگڑے اچھے نہیں لگتے۔"

"آنٹی!۔ تو کیا ماں یہاں بھی آئی تھی۔؟"

"وہ اس نے کیا کہا؟" اس کی آنکھوں کی دہشت اور بڑھ گئی اب میں اس ننھی سی بچی سے کیا کہتی۔ میرے ہونٹ کھل نہ سکے۔

" آنٹی میری ماں بڑی ظالم ہے اس نے زبردستی کر کے مجھے ہاسٹل سے نکالا۔ پڑھنے بھی نہ دیا۔ میرا امتحان قریب تھا۔ ضد کر کے گھر لے گئی کہ دو دن میں واپس چلی جانا۔ وہاں سے ایک دن کار میں مجھے مندر لے گئی۔ میری بڑی بہن بھی ساتھ تھی۔ مندر پہنچے تو دیکھا راکیش بھی تھا پھر آنٹی سب لوگوں نے مل کر مجھے مجبور کیا کہ راکیش کو ور مالا پہنا دوں۔ ہماری شادی ہو رہی ہے۔ میں رونے لگی۔ مجھے کیا معلوم شادی کیا ہوتی ہے؟۔

ماں نے سمجھایا تو میرے ہی پاس رہے گی۔ اب صرف بھگوان کے سامنے ور مالا پہنا دے۔ اور یوں راکیش سے میری شادی کر دی گئی۔ یہ دیکھو منگل سوتر راکیش نے پہنایا ہے"۔ رادھا اپنے گلے کا منگل سوتر دکھانے لگی۔

" رادھا۔ مگر تمہاری ماں کہتی تھی کہ تم۔ نے اپنی مرضی سے ......"

" نہیں۔ نہیں۔ بھگوان کی قسم آنٹی۔ یہ سب کچھ ماں نے کیا ہے وہ مجھے ہر جگہ۔ یوں ہی بدنام کرتی ہے۔"

" اچھا تو کیا۔ راکیش کے ماں باپ کو اس شادی کا علم نہیں رادھا۔؟"

" مندر میں راکیش کی ماں بھی تھی۔ وہ مندر سے مجھے اپنے گھر لے گئی تھی۔ اچھے کپڑے پہنائے تھے۔ کھلایا پلایا تھا۔ دو چار دن بعد ماں مجھے گھر لے آئی۔ میں نے ضد کی کہ مجھے ہاسٹل بھیج دو۔ میرا امتحان ہے۔ میں پڑھوں گی۔ مگر ماں راضی نہ ہوئی۔ مجھے خوب مارا پیٹا۔ کچھ دنوں بعد مجھے راکیش کے ساتھ یہاں بھیج دیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے آنٹی میں کیا کروں"۔

وہ پھر رونے لگی۔

بمشکل بارہ تیرہ سال کی لڑکی کتنی معصوم تھی۔ کتنی مظلوم بھی۔ "اور اب یہ کیا قصہ ہے۔؟"

" اب ماں نہیں چاہتی کہ میں راکیش کے ساتھ رہوں —————— —— وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ راکیش نے کہا تھا وہ ہمارے پاس ہی رہ جائے۔ مگر ماں نہیں مانتی۔ پہلے کچھ دن ہم دوسرے مکان میں تھے! تو ماں ساتھ تھی۔ دن رات لڑتی رہتی

راکیش سے بہت سارو پیہ بھی لیا۔ آنٹی جانے کیا کرتی ہے"۔ میرا دل اندر ہی اندر کڑھنے لگا۔ یہ کیسی دنیا ہے۔ کیسے لوگ ہیں۔ رادھا جو کہہ رہی ہے کیا یہ سچ ہے۔ یا یہ جو اس کی ماں نے کہا تھا وہ سچ تھا؟ میں یقین اور بے یقینی کے ترازو پر ڈول رہی تھی کہ رادھا بولی "آنٹی۔ میں کیا کروں مجھے بتا دو نا۔ ماں کہتی ہے وہ مجھے کسی دوسرے لڑکے سے بیاہ دے گی۔ وہ اس سے اچھا لڑکا ہے۔ ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔"

"ارے!" میرے تو اس پر جیسے زور دار بجلی گر پڑی۔ اور ایک ماں کی ٹھوس عظمت ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتی چلی گئی۔ راکھ بنتی چلی گئی۔

یہ کیسی ماں ہے؟۔ اپنی لڑکی کا بیوپار کر رہی ہے کیا؟ روپیہ پیسے کی حرص نے اس کے جذبات کو کھوکھلا کر دیا ہے؟ کیا وہ رادھا کی کچی جوانی سے کھیل رہی ہے؟ اسے ایک طوائف کے سانچے میں ڈھال رہی ہے؟ یہ کیسی ماں ہے؟ نہیں نہیں۔ کوئی ماں اتنی نیچ نہیں ہو سکتی۔ یہ اپنی بلندیوں سے زمین کی مکروہ پستیوں میں نہیں گر سکتی۔

"رادھا! کیا وہ تمہاری سگی ماں ہے؟" میں بھرے گلے سے پوچھ بیٹھی۔ "ہاں۔ پتا جی کو سورگباش ہوئے چار سال گزر گئے۔ ماں نے میری بہن کو بھی ایک امیر لڑکے سے بیاہا تھا۔ بہن اس سے لڑ جھگڑ کر چلی آئی تھی۔ اور اب وہ کسی دوسرے آدمی سے شادی کر چکی ہے۔ بہن بھی کہتی ہے کہ راکیش سے تیری شادی نہیں ہوئی تھی۔ اب ہم دوسرے لڑکے سے تجھے بیاہ دیں گے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں؟"

رادھا کی سسکیاں میری روح کی بنیادوں کو ہلاتی رہیں۔ میں نے جان لیا کہ رادھا کی ماں اور بہن کس قماش کی عورتیں ہوں گی لیکن معصوم رادھا کی زندگی وہ یوں برباد تو نہیں کر سکتیں۔ اس کی رگ رگ میں ذلت اور کراہیت کا زہر نہیں بھر سکتیں۔

"تمہیں راکیش کیسا لگتا ہے؟" یہ پوچھتے ہوئے میری آواز کپکپا اٹھی کیونکہ رادھا میری بچی کے برابر تھی۔ ناسمجھ اور معصوم ایک لمحے کو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تعجب کا رنگ سا امنڈا۔ پھر وہ سر جھکا کر بولی "مجھے نہیں معلوم!"

اس کا یہ سادہ سا جواب میرے دل میں تیر بن کر اتر گیا۔ اور ممتا کو لہولہان کر گیا۔

"اچھا یہ کہو وہ تمھارا خیال رکھتا ہے" "ہاں۔ روز روز اچھی اچھی چیزیں لاتا ہے۔ کھلاتا ہے پلاتا ہے۔ کہتا ہے میں تمھیں ماں کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔ اب اگر ماں آئی تو پولیس کو بلا لوں گا۔"

"اچھا تم ڈرو نہیں۔ ہم راکیش کو بھی سمجھا دیں گے اور تمھاری ماں کو بھی۔!"

"آنٹی" وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ اور سسکیاں بھر بھر کر روتی رہی۔ اور میری آنکھوں سے چند آنسو چھلک کر اس کے گھنگھریالے بالوں میں جذب ہو گئے۔!!

اس رات راکیش دیر سے گھر آیا تب تک رادھا میرے پاس رہی۔

پھر یہ معمول سا بن گیا کہ جب بھی وہ باہر جاتا رادھا کو میرے پاس چھوڑ جاتا۔ پتہ چلا کہ رادھا کی ماں نے اپنی بیٹی کا بیاہ دینے کا وعدہ کر کے راکیش سے بہت سا روپیہ اینٹھ لیا تھا۔ راکیش کی کافی زمینداری ہے۔ شہر میں بزنس کرتا ہے۔ فراخدل اور ہمدرد بھی ہے۔ وہ اپنے خرچ سے کئی لڑکوں کو پڑھاتا بھی رہا ہے۔ رادھا کی ماں اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ رو دھو کر پیسہ مانگ لیا کرتی تھی۔

پھر اُس نے اپنی بیٹی کو اس سے بیاہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور ایک دن مندر میں راکیش کی ماں کی موجودگی میں ہی دونوں کا بیاہ کرا دیا۔ وہ چاہتی ہے کہ راکیش اب بھی روپیہ دیتا رہے وہ اور اس کی بڑی لڑکی دونوں مل کر اسے خوب لوٹ چکے ہیں۔ اب راکیش نے روپیہ دینا بند کر دیا ہے اور چاہتا ہے کہ بڑھیا اس کے ساتھ ہی رہ جائے!۔ مگر وہ یوں راضی نہیں ہوتی۔ اسی لیے اب اس نے یہ چال چلی ہے کہ لڑکی کو بہکا کر لے جائے۔ وہ ایک اور مالدار لڑکا پھانس رہی تھی جو رادھا کی ایک جھلک پر مرمٹا تھا۔ اس دوران بڑھیا کئی بار آچکی تھی۔ اور سڑک پر کھڑی بکتی جھکتی واپس ہو گئی تھی۔ وہ نوجوان بھی اس گلی کے کئی چکر لگاتا نظر آتا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ راکیش پولیس میں رپورٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رادھا کم سن تھی۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

ایک بار رادھا بولی "آنٹی! کیوں نہ میں ماں کے ساتھ چلی جاؤں؟ یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو گا!"

"نہیں رادھا! اچھی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں وہ تمہاری زندگی خراب کردے گی۔ راکیش تمہارا پتی ہے۔ تم کو اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ تم ڈرو نہیں! کوئی کچھ نہ کرے گا۔ تم ماں سے کہہ دو کہ تم راکیش کو نہیں چھوڑو گی۔ جب تمہیں سمجھ آجائے گی تب معلوم ہوگا کہ دنیا کیا ہوتی ہے۔ راکیش اچھا لڑکا ہے۔ وہ تمہیں آرام سے رکھے گا۔" میری باتیں سنکر وہ چپکے چپکے روتی رہی۔ جذبات سے عاری چہرے پر بھولا پن تھا۔ بچپن کی معصومیت تھی۔ ناسمجھی کا کچا کچا رنگ تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ شوہر کیا ہوتا ہے۔ اور بیوی کیا۔!۔

اسے راکیش سے محبت بھی نہیں تھی نفرت بھی نہیں۔ وہ کبھی ماں کے پاس جانا چاہتی اور کبھی راکیش کے ساتھ رہنا چاہتی۔ اس کی زندگی ایک کٹی پتنگ کی طرح تھی جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ جس نے بھی باندھ لیا اُس کی ہوگئی۔ چاہے وہ راکیش ہو یا کوئی اور رادھا نے میرے پاس رہ کر پکوان بھی سیکھ لیا تھا۔ ہوٹلوں کا کھانا کھا کر وہ بیزار ہوگئی تھی۔ بار بار دوڑی آتی: "آنٹی۔۔ ترکاری کیسے بناتے ہیں؟ آنٹی کھچڑی پکانا سکھا دیجئے۔!

ایک صبح وہ بولی "ہم دوسرے محلے میں جاکر رہیں گے۔ راکیش نے مکان دیکھ لیا ہے۔ میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جاؤں آنٹی۔؟"

میرا دل بھی دکھ گیا۔ نہ معلوم اس کا مستقبل کیا ہو؟ یہاں رہتی تو جب بھی گھبراتی میرے پاس چلی آتی۔ اور میں اسے اچھی راہ دکھانے کی کوشش کرتی۔ مگر اب۔؟!

پھر جب وہ جانے لگی تو میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھرے گلے سے کہا: "میری بات یاد رکھنا رادھا بیٹی! کبھی راکیش کا ہاتھ نہ چھوڑنا۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ اچھی بیوی بن کر دکھانا۔" وہ آنسو پونچھتی چلی گئی۔ مکان خالی ہوگیا۔ گلی سنسان ہوگئی۔ لیکن میری آنکھوں سے اس کی وہ ہرنی جیسی آنکھیں نہ جاسکیں۔ سما کر رہ گئی تھیں۔ جیسے شیشے میں عکس بھر گئی دنوں بعد وہ مجھ سے ملنے آئی۔ ڈری سہمی سی لگی

"کیا بات ہے؟ اچھی تو ہو؟!"

"اچھی تو ہوں آنٹی۔ آپ بہت یاد آرہی تھیں"

"بیٹھو! میں بھی بہت یاد کرتی ہوں تمہیں۔" میں چپ چاپ اسے ٹٹولنے لگی اپنی نگاہوں سے

تڑپنے لگی۔ وہ کمزور اور زرد ہو رہی تھی۔

"ماں اور بہن نے ہمارا پتہ چلا لیا ہے۔ اب وہ روز روز آ کر تنگ کرتی ہیں پرسوں جب راکیش کہیں گیا ہوا تھا میری بہن ماں اور ایک لڑکا جو ڈاکٹری پڑھ رہا ہے آئے تھے اور میرے ساتھ خوب جھگڑا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آج ہی میرے ساتھ اس کا بیاہ کر دو۔ ورنہ خاموش نہ رہوں گا۔ تم لوگوں نے اب تک میرے دو ہزار روپے ہضم کر لیے ہیں۔"

"پھر۔؟" میری سانسیں رکنے لگیں۔

"پڑوس والوں نے انھیں ڈانٹ کر بھگا دیا۔ آنٹی! کیا میں زہر کھا کر مر جاؤں گی! میں مر جاؤں گی۔"

وہ منہ چھپائے روتی رہی۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر میں بولی "گھبراؤ نہیں۔ تم راکیش سے کہو کہ وہ یہ شہر چھوڑ دے۔ کچھ دنوں کے لیے سہی تم لوگ کہیں دور چلے جاؤ۔"

راکیش سے ماں نے جھگڑا کر کے ابھی ابھی ایک ہزار روپے لیے ہیں" "تم کوئی فکر نہ کرو بیٹی! بھگوان تمھاری مدد کرے گا تم لوگ جتنی جلدی ہو سکے کہیں دور نکل جاؤ۔"

"آنٹی میرے لیے دعا کرنا!" وہ پھر مجھ سے ملنے نہیں آئی لیکن اس کی وہ وحشتناک اور ویران سی آنکھیں بار بار میرے سامنے آتی رہیں!! آنکھیں جن میں کئی سوال تھے؛ حسرت و یاس تھی معصومیت تھی، میں ان آنکھوں کو کبھی بھلا نہ سکی۔ ہر جگہ ہر موڑ پر مجھے اُن آنکھوں کی تلاش رہی۔

پورے چار سال گزر گئے۔ وقت کی ریت لمحوں اور دنوں پر بچھتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھر ذہن سے وہ آنکھیں بھی دور ہوتی چلی گئیں۔ رادھا کی یاد رفتہ رفتہ مٹتی گئی۔ لیکن کبھی کبھی کسی کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر اس کی یاد آ ہی جاتی۔ جانے کہاں ہے؟ کیسی ہے؟! وہ ڈرپوک سی ناسمجھ لڑکی جو ایک ڈائن ماں کی حرص کا نشانہ بن گئی۔ اسی شام میں شاپنگ کر رہی تھی۔ کسی نے میرا آنچل پکڑ کر کھینچ لیا۔ میں چونک کر پلٹی "وہ کون؟"

"مجھے نہیں پہچانا آنٹی؟ میں رادھا ہوں!" ------- میرے سامنے وہی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ میں اسے بے پناہ خوشی اور حیرت سے تک رہی تھی "تم۔ تم رادھا ہو نا! اوہ! کتنی بدل گئی ہو اب کہاں ہو۔ کیسی ہو رادھا۔ تم تو ایسی گئیں کہ آنٹی کو پلٹ کر نہ پوچھا" میں ایک سانس میں اتنا سب

کہہ گئی۔ وہ سامنے کھڑی مسکراتی رہی۔ بھرپور مسکراہٹ! اور آنکھوں کی وہ دہشت، وہ مایوسی اب کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اُن آنکھوں میں ایک طرح کا ٹھنڈا اور میٹھا سا سکون تھا اور پاکیزہ سا نور بھی!۔

وہ چپ چاپ مسکرائے جارہی تھی۔ پھر چونک کر پلٹی اور پاس کھڑے نوجوان کی گود سے ایک گول مٹول بچہ اٹھا کر بولی "یہ دیکھو آنٹی! یہ ہے ہمارا اگڈو! اور یہ راکیش ہیں میرے پتی۔!"

"یہ۔ یہ۔ یعنی کہ رادھا۔ تم"، میری آواز خوشیوں کے سرگم پر تھرتھرا اٹھی۔ راکیش نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"نمستے آنٹی! میں آپ کا بے حد احسان مند ہوں کہ آپ نے رادھا جیسی ناسمجھ لڑکی کو زندگی کا راستہ دکھایا تھا آپ ہی کی بات پر ہم مدراس چلے گئے تھے۔ اب ہم دونوں خوش ہیں۔ کسی کا کوئی خوف نہیں ہے۔ رادھا کی ماں نے ہمیں تنگ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ ہار گئی ہے۔!!"

"بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم دونوں نے ہمت اور رہم خیالی سے دنیا کو ہرا دیا۔ رادھا ایک اچھی لڑکی ہی نہیں ایک مثالی بیوی اور ایک اچھی ماں بھی ہے نا!!" میں نے بھیگی آنکھوں سے رادھا کو دیکھا! اس کے معصوم چہرے پر پیار و محبت، وفا اور ممتا کی ملی جلی دھنک لہرا رہی تھی۔ وہی رادھا جو کل ایک بھولی بھالی معصوم سی بچی تھی آج ماں بن کر عظیم ہوگئی تھی۔ اس نے وہ جنت تعمیر کرلی تھی جو ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے بھرپور تھی!!

○○

گمشدہ منزل کے مسافر

"تم ؟" دو حیران آنکھوں اور دو سنجیدہ ہونٹوں نے پوچھا۔
"تم ؟" دو پشیمان آنکھوں اور دو پژمردہ ہونٹوں نے پوچھا۔
یہ آنکھیں اپنی سی لگیں، اپنائیت کا وہ رنگ جو کہیں اور دوسری نگاہوں میں کبھی نہ ملا تھا۔ وہی رنگ ... آج برسوں بعد ... ان آنکھوں میں نظر آ رہا تھا۔ جو برسوں پہلے کھو گئی تھیں۔ دھند اور مٹی کی دبیز چادروں کے پرے۔ غفلت اور نادانی کے گہرے ساگروں میں!

ایک لمحہ دو لمحے اور کئی لمحے بیت گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بالکل مقابل کھڑے تھے۔ پاس پاس۔ اور چہروں پر پہچان کی لکیریں تھیں ــــ پھر دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہ بول سکا۔ چونک کر، سنبھل کر سیٹیں ڈھونڈنے لگے۔ اتفاق سے دونوں کی سیٹیں برابر تھیں۔ ایئر ہوسٹس نے انھیں ان کی سیٹوں تک پہنچا دیا ــــ دونوں پھر ایک بار چونکے۔ آنکھوں نے پھر پوچھا "تم ؟!"

اور دونوں سمٹے سمٹے سے انجان بنے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا ــــ یہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی۔ برسوں بعد قسمت ہم دونوں کو کس قدر قریب لے آئی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو چھو سکتے ہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمارے جسموں کے درمیان ایک دو انچ کا ہی فاصلہ ہے۔ جو کسی پل مٹ بھی سکتا ہے!

میں ۔ میں انھیں دیکھ سکتی ہوں چھو سکتی ہوں۔ لیکن، دل کے اتھاہ سمندر میں ایک بھولا بسرا طوفان سا ابھرا! لیکن ہمارے دل ایک دوسرے سے بہت دُور ہیں۔ اور ہمارے ذہن بھی

ایک نہیں ۔۔ جانے ان کے دل میں کیا ہے ۔؟ وہ کیا سوچ رہے ہیں ۔؟! ہم ایک دوسرے کے پاس رہ کر بھی کس قدر دور ہیں، کتنی بڑی خلیج دلوں کے درمیان بن چکی ہے۔ جو ان دس برسوں میں پاٹی نہ جا سکی۔ دس سال۔ جیسے ایک عمر۔ ایک جگ ۔

کاش! یہ سفر عمر کے اس دور میں نصیب ہوا ہوتا جبکہ میرا زخمی دل پچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا۔ جبکہ میں ہار کر ۔۔ پچھتا کر بانہوں کی اُن پناہوں میں جانا چاہتی تھی جو عورت کے لیے ایک مضبوط قلعہ سے کم نہیں ۔۔ کاش قسمت بہت پہلے ہمیں اک دوسرے کے اتنا قریب ہونے کا موقع دیتی جس وقت کہ دلوں میں نفرت کی جڑیں اتنی گہرائی تک نہ اُتری ہوتیں ۔ کاش! ۔ کاش!!

مالا نے سر جھکا کر چپکے سے کنکھیوں سے اُسے دیکھا۔! اُس نے آنکھوں پر نیلا چشمہ چڑھا لیا تھا۔ اور انجان بنا نہ جانے سامنے کیا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے اک آہ نکل گئی۔ اب ہوائی جہاز اڑان میں ہے۔ فضا کی بیکراں بلندیوں کی جانب اڑا جا رہا ہے۔ اس کے خیالات کا طائر بھی پرواز کر رہا ہے۔ صرف مالا ہی نہیں امر بھی اپنے خیالات کی ڈوریوں میں کسا جانے کیا کیا سوچ رہا ہے۔ اس کے چہرے کی گمبھیرتا اور بھی گہری ہو چلی ہے۔ پیشانی پر ایک دو شکنیں ۔۔ لب بھینچے ہوئے۔

مالا۔! تم میرے سامنے کیوں آگئیں! میرے پاس میرے ساتھ تمہاری سیٹ کیوں لگ گئی ہے۔ کیا قدرت کوئی اور مذاق کرنا چاہتی ہے۔؟ کیا وقت کوئی اور کھیل کھیلنا چاہتا ہے؟ یہ تمہارے جسم سے اٹھتی ہوئی "او ڈی کولون" کی دھیمی دھیمی مہک کن بھولی بسری وادیوں کی طرف لیے جا رہی ہے مجھے؟ تمہارے قرب کا طلسمی احساس کن خواب زاروں کی طرف اشارہ کر رہا ہے نہیں مالا۔ نہیں ۔۔ بھگوان کے لیے مجھے کچھ نہ یاد دلاؤ۔ میں راکھ کا ایک ڈھیر ہوں۔ اُسے کریدنے کا تمھیں کوئی حق نہیں پہنچتا۔ تم ۔۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ چلی جاؤ ۔۔

ہوائی جہاز اڑ رہا ہے۔ ہلکے پھلکے بادلوں کی نرم سطح سے گزرتا ہوا ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے تصورات ماضی کی دودھیا دھند کی چادروں کو چاک کر کے ٹوٹے ہوئے خوابوں کو تلاش کر رہے ہوں۔

مالا کی نگاہیں، نشست بدلتے ہوئے غیر ارادی طور پر امر کی جانب اُٹھ گئیں۔ وہ بھی

مڑا اور رنگوں شیشے سے جھانکتی دو گہری چمکیلی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔ لب کچھ کہنے کے لیے مچلے، کانپے لیکن کھل نہ سکے۔ جیسے اندر سے کسی نے انھیں بند کر رکھا ہو۔ جیسے دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہوئے بھی پہچاننے سے انکار کر رہے ہوں ـــ جہاز کی گڑگڑاہٹ کانوں میں گونج رہی تھی! اور گرد و پیش کا احساس دلا رہی تھی۔ مالا نے جھک کر پلکیں جھکالیں اور امر نے بھی گھبرا کر منہ پھیر لیا۔

وقت پل پل بہتا رہا ـــ! مالا کی آنکھیں پھر امر کی جانب مڑیں۔ اور جیسے اپنے معبد کا طواف کرنے لگیں۔ وہی چوڑے چکلے شانے ـــ وہی مضبوط گردن، بالوں کا وہی انداز۔ لیکن یہ کیا؟ کنپٹیوں کے پاس اجلی کرنوں کا باریک سا جال ابھر آیا ہے۔

تب تو بال بیحد سیاہ گھنگھریالے اور گھنے تھے۔ لیکن اب بال کم بھی ہو گئے ہیں اس کے جی میں آئی کہ آہستہ سے امر کے شانے پر ہاتھ رکھ دے۔ اور اپنائیت کا وہ لمس محسوس کر لے جس کے لیے وہ برسوں سے تڑپتی رہی ہے ـــ! یہی تو ہے میرا مندر۔ یہی تو وہ دہلیز ہے جہاں ماتھا ٹیکنے کی حسرت لیے ساری عمر سسکتی رہی ہوں۔ مالا کا لرزتا ہاتھ چپکے سے آگے بڑھا۔ دل کی دھڑکن جہاز کی آواز کو چیر کر بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہاں مالا! یہی وہ لمحہ ہے جس کی تو متلاشی تھی ـــ "نہیں!!" اس کے ہونٹوں سے نکل گیا امر چونک کر پلٹا۔ مالا سہم گئی تھی۔ چہرہ پسینے سے شرابور امر کے لب پھر بھی نہ کھلے۔ اس کی آنکھوں میں اب بیگانگی کے گہرے رنگ تھے، نفرت کی دہکتی سی آگ تھی۔ مالا نے چپکے سے کھڑکی کی جانب نگاہیں مرکوز کر دیں۔ امر کی دھڑکنوں میں تلاطم تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی انجان نظروں سے مالا کو دیکھنے لگا۔ اس کا حسین چہرہ صرف آدھا ہی نگاہوں کی زد میں تھا! وہی ناک، وہی ہونٹ ـــ وہی تراشیدہ سیاہ بال ـــ لیکن یہ کیا؟ اب مالا کے بالوں میں یہاں وہاں چاندی جھلملا رہی ہے۔ اتنی جلدی؟ نہیں نہیں۔ مالا کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو ہماری شادی ہوئی ہے۔ ابھی تو ہمارے آنگن میں کوئی پھول بھی نہیں کھلا ـــ!!

ـــ مالا کا وہ عنابی رنگ کیا ہوا! اس کے بھرے بھرے گالوں کو کس کی نظر لگ گئی ہے! مالا ـــ مالا ـــ تم مجھے چھوڑ کر اتنے دنوں کہاں چلی گئی تھیں؟ تمہارے بغیر میں نے زندگی شعلوں پر بسر کی ہے۔ دل کے گھاؤ لیے شہر شہر بھٹکتا رہا ہوں۔ تم نے مجھے جینے بھی نہ دیا تو مرنے بھی نہ دیا۔ مگر یہ تم۔

اتنی اداس اتنی تنہا سی کیوں لگ رہی ہو۔ کیا تم بھی۔ میرے لیے تڑپتی رہی ہو؟ — جواب دو مالا۔

— مالا!" امر کے ہونٹوں نے مالا کا نام لے لیا۔ وہ بے اختیار چونک کر مڑی —

"تم — آپ نے کچھ کہا؟!" — دونوں کی آنکھیں ملیں۔ گھبراہٹ شرمندگی پچھتاوا۔ کیا کچھ نہ تھا مالا کی آنکھوں میں؟ امر آنکھوں آنکھوں میں اسے تولنے لگا۔ دل کی گہرائی میں اتر کر اسے جانچنے لگا۔

"آپ نے میرا نام لیا تھا؟!" ایک آس نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں آپ کا نام نہیں جانتا" نفرت نے بے رخی سے جواب دیا۔

مالا۔ زخمی ہرنی کی طرح تڑپ اٹھی۔ تکلّف کی ساری دیواریں ایک ہی جھٹکے میں گراتے ہوئے بولی "تم یوں انجان نہیں بن سکتے امر۔ میں جانتی ہوں میرا گناہ ایسا نہ تھا کہ فراموش کیا جاتا۔ لیکن تمہیں بتا دوں کہ جس بھول سے مجھے تم سے سدا کے لیے جدا کر دیا تھا اس بھول کی سزائیں ان دس برسوں میں بھگت چکی ہوں۔ اتنا کہ اب ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر چکی ہوں۔ تم۔ تم اب اور سزا نہ دو امر۔ اب اور سزا نہ دو امر" مالا کا لہجہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا دل بھی زخمی تھا۔ وہ یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا۔

"مالا۔ پلیز! اب زخم کریدنے سے کیا حاصل سوائے جلن کے، یہ کہو تمہیں کہاں جانا ہے"

وہ ایک طنزیہ ہنسی ہنس کر بولی "ایسی تو کوئی جگہ نہیں امر جسے اپنا گھر کہہ سکوں، تقدیر کبھی کبھی یوں بھی ظالم بن جاتی ہے کہ ٹکنے کا آسرا بھی نہیں دیتی" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ جیسے اپنے اندر اٹھتے طوفان کو دبا رہی ہو۔ اس کے رخساروں پر خون کی تیز گردش نے ہلکی سی سرخی ابھار دی ہے۔ نچلا ہونٹ بار بار کاٹ رہی ہے۔ پیشانی پر ننھے ننھے موتی جھلک آئے ہیں۔ امر سے دیکھا نہ گیا۔ اس نے چپکے سے پوچھ لیا "میں نے سنا تھا کہ تم جرمنی میں مقیم ہو گئی ہو تو کیا وہاں تمہارا گھر نہیں ہے؟!" مالا دھیمی ہنسی ہنس پڑی "کہیں مقیم ہو جانے سے وہ اپنا گھر نہیں کہلاتا! گھر تو وہ ہوتا ہے امر۔ جہاں عورت مرد مل کر ایک دوسرے کے سہارے جیتے ہیں۔ تنہائی جس کا مقدر ہو وہ ہجوم میں بھی اکیلا ہوتا ہے۔ بے سہارا اور بے گھر" امر کانپ اٹھا۔ مالا کی باتوں میں زہر گھلا ہوا تھا۔

"تو کیا؟" وہ بات پوری نہ کر سکا۔ ادھورا سوال مالا کے لیے مکمل ہی تو تھا۔

"ہاں امر! جس کی خاطر تم سے ناطہ توڑا تھا جس کے موہ نے ایک بیاہتا عورت کی زندگی میں زہر گھول کر اُسے محبت کی حسین دنیا کے رنگ دکھانے تھے وہ کوئی مستقل سہارا نہ تھا۔ جرمنی پہنچ کر ہم S.O.M کر رہے تھے کہ وہ کسی اور کی بانہوں میں کھو گیا۔ اور رہ گیا ایک چہرہ۔ زخمی اور لہو لہان۔ اسے ملا پچھتاوہ ۔۔ اور جلن" وہ ایک دوبل کوڑ کی۔ نظریں نیچی کیے کیے ہی بھر بولی ۔۔۔
'ایک بار جب پیروں تلے پھسلن آجاتی ہے امر تو انسان گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ سنبھل نہیں پاتا۔ چاہ کر بھی کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کوئی اس گرتے کو سنبھالنا چاہے تو۔ اور بات ہے۔ تو ہاں! میں کہہ رہی تھی کہ تقدیر نے گن کر ایک ایک کر کے سارے بدلے لے لیے ہیں۔ ایک خطا کے جرم میں ان گنت سزائیں مل چکی ہیں مجھے ۔ پردیس میں جب کوئی کسی کا اپنا نہ رہے تو وہ کتنا تنہا ہوتا ہے۔ کتنا بے آسرا؟! شاید تم یقین نہ کر سکو کہ غلط قدم کے فوراً بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اپنے کیے پر پشیمانی تھی۔ شرمندگی تھی۔ لیکن جو قدم اٹھ چکا تھا وہ کیسے پلٹتا؟ زمانہ کیا کہتا امر؟!

"تم اپنے گھر بھی آسکتی تھیں مالا!" وہ ہولے سے بول اُٹھا۔

امر؟!" ایک ناقابلِ یقین حیرانی اس کی آنکھوں سے سما گئی ۔۔" تو۔۔ تو کیا تم۔۔ مجھے قبول کر لیتے؟!" وہ آہستہ سے بولی ۔۔

"شاید ۔۔ اس لیے کہ گھر سے تم خود گئی تھیں میں نے نہیں نکالا تھا۔ اور جب کسی کو اپنے گناہ کا احساس ہو جاتا ہے تو خدا بھی معاف کر دیتا ہے۔" امر نے رُک رُک کر ایک ایک لفظ تولتے ہوئے جواب دیا۔

مالا کے پژمردہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی" احساسِ گناہ اور شکست ہی نے تو مجھے تمہارے پاس آنے سے روکے رکھا۔ زندگی کو میں نے ایک عذاب کی طرح سہا ہے امر! حالانکہ میں ایک بلند مرتبہ ڈاکٹر ہوں۔ میری عزت شہرت سب کچھ ہے لیکن ایک کمی ایک خلا کے سوا زندگی کچھ بھی نہیں ۔" مالا کی پلکوں پر دو آنسو آٹپکے ۔ جس کو اس نے ہاتھ کی پشت سے پونچھ کر سر جھکا لیا۔ امر گم صُم سا ٹوٹا بکھرا سا اُسے تکتا رہا۔ کیا کہے؟ کیا نہ کہے۔ نفرت کی پرتیں ایک ایک کر کے اُترنے لگیں ۔۔" تم نے نہیں بتایا۔ تم جا کہاں رہی ہو؟!"

مالا نے آہستہ سے سر اٹھایا اور اس کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"میری کوئی منزل نہیں ہے! لیکن ایک بار اُس دھرتی کی مٹی کو اپنی مانگ میں بھرنا چاہتی ہوں، جہاں میرا سہاگ رہتا ہے"۔۔۔ امر سارے بدن سے کانپ اٹھا۔ وہ ضبط کی چٹانوں سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے مالا نے پوچھ لیا۔
"میں نے سنا تھا کہ تم شادی کر رہے ہو؟!"۔۔۔ امر مسکرانے لگا
"شادی؟ او ہاں! کی تو تھی ۔۔۔" مالا کے چہرے پر کالی گھٹاؤں کا سایہ اُتر آیا۔ تب ہی امر بولا "شادی تو ایک بار کی تھی ۔۔۔ تم سے!" پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا "بیاہ کے صرف تین مہینوں بعد جب تم M.D کے لیے بمبئی چلی گئیں اور وہاں پہنچ کر تم نے اُس بیوقوف سے منہ موڑ لیا جس سے تمھیں یہ گلہ تھا کہ وہ تم سے والہانہ پیار نہیں کرتا ۔۔۔ اُسے محبت کرنا نہیں آتی۔ وہ صرف ایک بے حس پتھر ہے۔ صرف ایک محنتی ڈاکٹر ہے۔ شوہر نہیں!! وہی بے حس پتھر ۔ تمھارا غم سینے سے لگائے زندگی بھر سلگتا رہا ۔۔۔ زمانے نے ہنسی اُڑائی۔ طنز کے پتھر پھینکے۔ ماں نے دوسری شادی کی بار بار صلاح دی۔ مگر۔ مگر تمہارا پیار۔ اس سے بھلایا نہ گیا۔ نہ میں تمھیں معاف کر سکا نہ ہی بھلا سکا ۔!!"
"امر خدا کے لیے اُس ناگن کو کبھی معاف نہ کرنا۔ جس نے تمھیں جہنم کے غاروں میں دھکیل دیا ہے۔ کبھی معاف نہ کرنا۔ کبھی" وہ سسکنے لگی۔ اور تب امر نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر مالا کا ہاتھ تھام لیا "مالا۔ ہماری منزل قریب آ رہی ہے۔ بنگلور میں ہمارا نرسنگ ہوم ہے۔" مالا نرسنگ ہوم؟! وہ کب سے تمہارا انتظار دیکھ رہا ہے"
"نہیں۔!" وہ خوشی اور دکھ کے گہرے ساگروں میں ڈوبنے ابھرنے لگی اس کی آنکھوں سے موتی لڑھکتے رہے۔ اس نے لرزتا کانپتا ہاتھ امر کے شانے پر رکھ دیا اور کھوئی ہوئی اپنائیت کا اک گہرا احساس اس کی رگ رگ میں سرائیت کر گیا:
جہاز سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر رک چکا ہے ۔۔۔ امر مالا کا ہاتھ تھامے زینوں سے اُتر رہا ہے ۔۔۔ اُن کی منزل آ چکی ہے!!

OO

طوفان کے بعد

ایک مرد کی کہانی جو دو حصوں میں بٹ گیا

ایک دلکش سحر آگین تبسم اس کے ترشے ہوئے ہونٹوں پر ہمیشہ بکھرا رہتا تھا گلاب کی دو پنکھڑیوں کی طرح اس کے لب شگفتہ تھے۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں، بنی ہوئی بھنوئیں گالوں پر ہلکا سا غازہ، ماتھے پر میک اپ کی ہم رنگ بندی، گلابی شیفون کی ساڑی اور بلاؤز۔ اور لمبی سی ناگن کمر تک جھولتی ہوئی موگرے کا بڑا سا گجرا، چوٹی کے ساتھ آویزاں۔۔ رما آئینے کے سامنے کافی دیر سے موجود تھی۔ آج لیڈیز کلب میں پارٹی تھی۔ اور وہ چاہتی تھی کہ وہاں اس کی ٹکر کا کوئی نہ ہو۔ اس نے ایک بار پھر مختلف زاویوں سے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور اپنے آپ کہہ بیٹھی۔

'رما آج تو جانِ محفل ہو گی'۔ اور ہوا بھی یہی۔

وہ جونہی کلب پہنچی چاروں طرف سے تعریفی نظروں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ہنستی بولتی اور قہقہے لگاتی رہی۔ زندہ دلی کے نغمے بکھیرتی رہی۔ سنجیدہ سی باوقار رما دوستوں کی محفل میں اپنے آپ کو بھول کر ایک شوخ الھڑ لڑکی کا بہروپ بھر لیتی تھی۔ وہ بے حد اسپورٹیو SPORTIVE تھی۔۔۔ بیڈ منٹن ہو کہ ٹیبل ٹینس، کیرم ہو کہ کارڈز وہ ہر گیم میں حصہ لیتی تھی۔ کلب کے ممبرز اس کی زندہ دلی کے گیت گاتے!۔ سب کے ہونٹوں پر رما کا نام ہوتا!؟

"بھئی رما تمہارا ابھی کوئی جواب نہیں۔ چڑیا کی طرح چہکتی ہوئی" گیتا بولی۔

"تو کیا تمہاری طرح گھر کی چار دیواری میں دم توڑ دوں؟" رما نے جھٹ سے جواب دیا۔

نجمہ نے فوراً چوٹ کی۔ "اری کہتی کیوں نہیں کہ کہاں تیری طرح پٹاخہ بن کر کالونی کے چکر لگاتے پھریں"؛ "گھر بار سنبھالنا۔ بچوں کی دیکھ بھال ـــ بڑی مشکل سے تو کھیل کے لیے وقت نکالتے ہیں ہم لوگ۔۔!"

"گویا۔ صرف تم ہی گھر والیاں ہو ـــــ ہم جیسے فٹ پاتھ پر رہتے ہیں۔" رما کی حاضر جوابی کا بھی جواب نہ تھا۔

اس پر ایک جاندار قہقہہ پڑا۔

"بھئی اپنی اپنی فطرت پر ہے۔ تفریح، کھیل کود، وہ تو صرف ہماری رما کا حصہ ہے۔ دیکھو تو کیسے سلیقے کی زندگی ہے۔ ہر کام وقت پر کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ مشین پر ڈھیروں سلائی بھی کر لیتی ہے۔ پچ گیتا! تم دیکھو تو پھڑک اٹھوگی۔" کمل رما کی گہری دوست تھی۔ وہ تعریف کے پھول برسانے لگی اور رما کے چہرے پر کئی رنگ آتے جاتے رہے۔

نجمہ نے کہا۔ "اچھا! تو بھئی۔ کسی دن ہم ضرور آئیں گے۔ تمہارے گھر تمہاری سلائی دیکھنے۔"

"لیکن بے وقت مت ٹپک پڑنا۔ پہلے سے اطلاع کر کے آنا۔ میں بزی رہتی ہوں۔"

"بڑی منہ پھٹ ہو جی!۔ ہم گھر آنا چاہیں اور تم فوراً ٹوک دو۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

"ہم تو من کے صاف لوگ ہیں چاہے کوئی برا ہی مانے! تم ضرور آؤ لیکن اطلاع کر کے، تاکہ میں وقت نکال لوں۔ بھئی بات یہ ہے کہ رما کے صاحب جو گھر پر رہیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ۔۔۔!"

"شٹ اپ کیا بکواس ہے! میں تو کھیل کی بات کر رہی تھی۔ ہاں تو نجمہ! تم دوپہر تین بجے چلی آنا۔ بائی۔" رما تیزی سے باہر چلی گئی۔

رما اپنا سارا کام ختم کر کے بستر پر آلیٹی ہے۔ تھکن سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں ـــ جسم ٹوٹ رہا ہے۔ رات کے نو بجنے کو ہیں۔ جوں جوں وقت کی گاگر چھلکتی جا رہی ہے اس کے دل میں عجیب زخمی احساسات جنم لیتے جا رہے ہیں۔ کون آئے گا جس کا انتظار کروں؛ سامنے والے کوارٹرز میں بچوں کی چہکار مچی ہے۔ شام چھ بجے ہی مسٹر اشوک آگئے ہیں۔ میں نے کھڑکی کی اوٹ سے دیکھا تھا۔ ریتا مسکراتی ہوئی اشوک کا استقبال کر رہی تھی۔ اور مسٹر اشوک نے اسے گہری مسکراتی نگاہوں سے دیکھا تھا اور چند لمحوں بعد شوخ ہنسی کی آواز آرہی تھی۔

میں کس کا انتظار کروں؟ یہ میرے بھاگ کی ریکھا نہیں نہیں کہ شوہر صبح کا گیا شام کو گھر آئے تو مسکراہٹ کے ہار لیے دروازے پر خوش آمدید کہوں! میری قسمت میں تو ایک طویل انتظار ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ کس کو میرے دل کی کسک کا احساس ہوگا؟ کون کام ختم ہوتے ہی دیوانہ وار گھر کی طرف دوڑا آئے گا۔ میری تقدیر میں تو بس یہی ہے کہ ایک گرہستی عورت کی طرح اپنے فرائض انجام دیتی جاؤں۔ مشین کی طرح گھر بار چلتا رہے۔ اپنی ساکھ پر کوئی حرف نہ آنے نینا کو اس بات کا احساس نہ ہونے دوں کہ اس کے ڈیڈی کس لیے اس قدر بزی رہتے ہیں؟ وہ ہر شام گھر کیوں نہیں آتے؟۔ اتوار کا سارا دن کہاں گزارتے ہیں؟..

نینا کل بھی ضد کر رہی تھی ـــ "ممی سب کے ڈیڈی اتوار کا دن گھر پر گزارتے ہیں۔ سب مل کر گھومنے جاتے ہیں۔ ہمارے ڈیڈی ہمارے پاس کیوں نہیں آتے۔؟"

"بیٹی تمھارے ڈیڈی بہت بڑے انجینیر ہیں نا! انھیں اپنے کام کے سلسلے میں باہر جانا پڑتا ہے۔" وہ اسے سمجھانے لگی۔ "یہاں دوسرے انجینیر بھی تو ہیں۔ پھر وہ اتوار کو گھر پر کیسے رہتے ہیں؟"

"بھئی! سب کے کام الگ ہوتے ہیں۔ ذمہ داری الگ ہوتی ہے اچھا! اب کے اتوار کو ہم پکنک پر چلیں گے۔"

"ممی۔؟" اور نینا سسک کر اس کے سینے سے لگ گئی جیسے اپنا دُکھ بھولنا چاہ رہی ہو۔ــ رما کو لگا کہ دیواریں گرتی چلی جا رہی ہیں۔ پردے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ اس کے سینے میں جوالا مکھی اُبل رہی ہے۔ آنکھوں میں انگارے دہک اٹھے ہیں، وہ کیسے ضبط کرے؟۔ کیسے ضبط کرے۔ـــــ اس نے دھیرے سے نینا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پلکوں پر مچلتے آنسو چپکے سے پی لیے۔ جھک کر نینا کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیے۔

جب اسے رات کی بات یاد آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ رخسار بھیگنے لگے۔ گالوں کی گلابی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ آج کی شام بھی اس کے لیے انگارے لائی تھی۔ بے پناہ غم اور ٹیسیں ۔۔۔ تنہائی اور جلتے لمحات ۔۔۔ اسے نہ جانے کیوں یہ خوش فہمی ہو گئی تھی کہ شاید وہ ضرور آئیں گے اس لیے وہ پارٹی سے جلد بھاگ آئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سے کام ختم کیا تھا۔ اور لباس تبدیل کیے بغیر بناؤ سنگار کر کے راج کا انتظار کرنے لگی تھی ۔۔۔!

وقت ڈھلتا جارہا تھا۔ نینا کتابیں بند کرکے بستر میں جالیٹی تھی سناٹا گہرا ہوتا جارہا تھا۔ اس کے کان کار کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ لیکن راج کو نہ آنا تھا نہ آئے اس کے دل پر مایوسی کے سائے پھیلنے لگے۔ جب اس کی امیدوں کے چراغ بجھ گئے تو اس نے ایک ایک کرکے سارے زیور اتار کر بستر پر پھینک دیے۔ پھولوں کا گجرا نوچ دیا۔ مسلے ہوئے بن کھلے پھول فریادی بن گئے۔۔۔ سوجی سوجی آنکھیں۔۔۔ سرخ ہو رہی تھیں اس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو چونک پڑی۔ اس کے چہرے کا نقاب تو اتر چکا تھا! وہ نینا کے سامنے جانے سے گھبرائی۔ اور تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی۔

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی نینا نے پوچھا۔

"ممی! ڈیڈی آج بھی نہیں آئے!" اسے یوں لگا جیسے نینا نے اس کے سینے میں برچھی اتار دی تھی۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ ابھی وہ کوئی جواب سوچ رہی تھی کہ نینا نے پھر پوچھا۔

"ممی! ڈیڈی دو دن سے گھر کیوں نہیں آئے۔؟"

"پہلے ناشتہ کرلو پھر باتیں کریں گے" رما نے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی لیکن نینا کی آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے۔

ممی کے بہلاوے اب بے اثر ہو گئے تھے۔ وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ رما نے اسے اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ نہ جانے کیسی کیسی تدبیروں سے وہ نینا کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہوئی۔۔ اور کتنی خوشامدوں کے بعد وہ اسے ناشتہ کی میز پر لائی۔ آج نینا کے آنسوؤں نے اس کے روح و دل کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ "اب اور نہیں سہا جاتا یہ غم۔ نہیں سہا جاتا بھگوان!!" وہ تڑپ اٹھی۔ اس کے ذہن کے اندھیروں میں ماضی کے چراغ روشن ہونے لگے۔ اسے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ اس کی شادی کے ابتدائی تین سال کیسی مستی و رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ راج اس پر بھنورے کی طرح منڈلایا کرتا تھا۔ دونوں نے زندگی کے سارے حسین اور شوخ رنگ اپنے بیاہتا جیون میں بھر لیے تھے۔ اس کے ذہن کے پردوں پر ماضی کی شوخ تصویریں مسکرانے لگیں۔ راج اور رما رما اور راج!! ایک دوسرے کے لیے۔۔۔ ایک دوسرے میں سمائے ہوئے۔

پھر یہ تصویریں دھندلی پڑنے لگیں۔ وقت کی گرد نے اس کے سارے رنگ اڑا دیئے۔ رما اور راج کی آنکھوں میں ایک دیرینہ حسرت جھانکتی رہ گئی۔ ان کے آنگن میں کوئی چہکار نہیں تھی۔ گھر کے قرینے میں توڑ پھوڑ اور طوفان مچانے والا کوئی نہیں آیا تھا۔

یوں شادی کے پورے پانچ سال چپ چاپ نکل گئے۔ جیسے کانچ کی گولی جو ایک بار پھسلی تو پھسلتی ہی چلی گئی ـــــ راج کی تمنا اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس نے علاج معالجے کروائے۔ وہ کوشاں تھی کہ جہاں جیون کی ساری خوشیاں سارا پیار راج کی جھولی میں ڈالا ہے وہیں ایک ننھے منے جیتے جاگتے کھلونے کی سوغات بھی دے سکے لیکن زندگی کی پھیکی تصویر میں وہ رنگ نہ بھر سکا جو نہ جانے کب اور کیسے قدرت نے اُن کی پہنچ سے دور کسی گمنام وادی میں پھینک دیا تھا۔

راج کے چہرے پر گمبھیرتا کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ راج اب اس کے آگے پیچھے گھومنے والا راج نہ رہا۔ کہیں میں اسے کھو نہ بیٹھوں۔ وہ گھبرائی۔ سٹپٹائی اور کسی فیصلے پر پہنچ کر اُس نے بھابی سے کہا "بھابی! میری ایک عرض ہے!"

"کہو بھئی! ـ کیا بات ہے" بھابی مسکرائیں۔

"وعدہ کرو کہ تم اپنی رما کا جیون بچا لوگی" وہ سنجیدگی سے بولی تو بھابی چونکیں۔

"کیا بات ہے پگلی ـ؟"

"بھابی اب کی بار تمھاری کوکھ سے جو پھول جنم لے گا، وہ مجھے دے دیجیے"

"اری اتنی سی بات! ابھی لے جا۔ گڈو، منی تیرے ہی تو ہیں"

"نہیں بھابی! مجھے تمھاری تیسری اولاد چاہیئے۔ جس کو یہ بتایا جا سکے کہ راج اس کے پاپا ہیں اور ـــ اور رما اس کی ممی ـ!" رما کی گمبھیرتا نے بھابی کو حیران کر دیا۔ وہ سہم گئی۔ پھر اسے گلے سے لگالیا "ایسا ہی ہوگا۔ تو فکر نہ کر۔ کیا راج بھی مان لیں گے؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دیجیے بھابی!"

پھر کچھ عرصے بعد بھابی نے ننھی نینا کو، جو نرم نرم گوشت کی پوٹلی تھی۔ رما کی گود میں لا ڈالا تھا۔ نینا جس کو بھابی نے اپنا دودھ بھی نہیں پلایا تھا۔ راج پہلے تو جھجکا "رما۔ مگر یہ ـ یہ" ـ ہاں راج!

یہ بے بی بماری ہے اس نے اپنی ماں کا دودھ بھی نہیں پیا ہے۔ اور میں نے تو بھابی سے اسے بہت پہلے مانگ لیا تھا۔"

بھابی کے اتنے بڑے ایثار کی بات سن کر راج نے سر جھکا لیا تھا۔ پھر اس کا چہرہ دمک اُٹھا۔ ہونٹ کانپے، مچلے اور اس نے جھک کر شال میں لپٹی بچی کی پیشانی چوم لی۔ اور زندگی میں دھنک کے سارے رنگ بھر گئے!! لیکن آج وہی راج اپنی نینا سے لاپرواہ ہوگیا تھا۔ وہ اور نینا دونوں سے دور ہوگیا تھا۔ وہ کئی کئی دن تک ان کی خبر لینے کے لیے بھی نہیں آتا تھا۔ ان کے درمیان یہ بے رحم فاصلہ نہ جانے کب اور کیسے پھیل گیا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے، ہر وقت نقاب ڈالے رہو۔ ہر پل جھوٹی مسکان کا میک اپ چہرے پر تھوپے رہو۔ مرکر بھی زندہ رہو تاکہ لوگوں کو یہ پتہ نہ چلے کہ رما مر چکی ہے! یہ تو وہی جانتی تھی کہ اب اس کا اپنا نہیں رہا۔ وہ کسی اور پر مر چکا ہے۔ اس نے کسی اور سے دامن باندھ لیا ہے۔ اس کے پیار کا اس کی زندگی کا بٹوارہ ہو چکا ہے پھر بھی وہ زندہ ہے ــــ ہنستی ہے ــــ کھیلتی ہے۔ اور سوسائٹی میں فخر سے سر اٹھا کے چلتی ہے!!

اسے اس حادثے کا تب پتہ چلا تھا جب تصویر کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ نہ جانے کب اور کیسے راج ایک کنوری ــــــ لڑکی کے چنگل میں پھنس گیا۔ لڑکی بے حد حسین تھی اور راج کی دولت اور شخصیت پر مر چکی تھی۔ راج کو یہ پتہ نہ تھا کہ لڑکی اس کے پیچھے پڑ جائے گی ــ ایک بار جو پاؤں پھسلے تو پھر اسے سنبھلنا دشوار ہوگیا۔ اور یوں وہ لڑکی اس کے ساتھ اپنا گھر بار، اپنا گاؤں چھوڑ کر چلی آئی۔ راج اتنی ہمت نہ کر سکا کہ اسے رما کے پاس لاکر ٹھہراتا۔ اس نے پاس والے گاؤں میں اسے مکان لے کر دیا۔ لڑکی نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کی کفالت نہیں کرے گا تو وہ کورٹ تک جا سکتی ہے۔ یوں۔ راج دو کشتیوں کا ملاح بن گیا۔ رما کو یوں لگا کہ اس کی جیون نیا میں سوراخ تو پڑ ہی چکا ہے وہ اب ڈوبی کہ تب ڈوبی!! دور دور تک اندھیرے اور ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا لیکن اسے نینا کی خاطر جینا تھا۔ نینا کا وجود اس کے لیے اس گھپ اندھیرے میں ایک ننھی سی قندیل کے مانند تھا۔ جو اسے جینے کا سہارا دے رہی تھی۔ اسی لیے اس نے جھوٹی مروت کا نقاب چڑھا لیا، اور انجان بن گئی۔ وہ راج پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اندر سے ٹوٹ چکی ہے اور راج کا راز اس نے جان لیا ہے۔ اور راج قدم قدم پر اس

سے جھوٹ کہتا ہے کام کے بہانے اکثر گھر سے باہر رہتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایسا کر کے راج کی ہمت بندھا رہی ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ راج کو ایک مجرم کی حالت میں اپنے سامنے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس کا بھرم نہیں توڑنا چاہتی تھی۔

راج نے کبھی اس کا دل نہیں دکھایا تھا۔ اس پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ زندگی کی ساری خوشیاں اسے دے رکھی تھیں۔ لیکن رما نے اسے کیا دیا تھا؟ اتنا پیار اور اتنا سکھ دینے والی کی ایک ہی آرزو تھی ۔ لیکن وہ اس کی یہ آرزو بھی پوری نہیں کر سکی تھی۔ اور راج اندر ہی اندر اپنی حسرت کی آنچ سے پگھل رہا تھا۔ اس محرومی نے اس کے دل و دماغ کو مجروح کر رکھا تھا۔ اور اس زخم سے بوند بوند لہو کتنے ہی دنوں سے اس کے شعور کے دامن پر ٹپک رہا تھا۔ رما کو خوف تھا کہ اگر اس سے جھگڑا کیا تو ممکن ہے کہ وہ گھر آنا ہی چھوڑ دے اور جو کھیل اس نے چھپ کر کھیلا تھا اس کا راز افشا ہو جانے سے وہ ہمیشہ کے لیے اس سے منہ پھیر لے۔ اس کے دل میں راج کے لیے بڑی گہری محبت تھی وہ اسے مظلوم بھی سمجھتی تھی۔ وہ کسی قیمت پر راج کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ اس طرح بھی اس سے دور ہو گیا تھا۔ ان کے درمیان حالات نے ایک خلیج پیدا کر دی تھی۔ اور ننھی نینا کا آخر کیا قصور تھا؟ وہ معصوم کس جرم کی سزا بھگت رہی تھی۔ اس کا ڈیڈی اس سے کیوں چھن گیا تھا۔

نینا کو راج کا لاڈ پیار سب کچھ ملا تھا۔ انھوں نے اسے عمدہ تعلیم و تربیت غرضیکہ سب کچھ دیا تھا۔ راج بھی نینا کو بہت چاہتا تھا۔ رما سوچتی تھی کہ سب ناتوں کے باوجود نینا راج کے خون کا حصہ نہیں تھی۔ اسی لیے۔ شاید اس بیچاری کو ڈیڈی سے دوری کا عذاب جھیلنا پڑ رہا ہے۔

راج اپنی جگہ حالات کے شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے۔ سچ مچ باپ بن جانے کے بعد اس لڑکی کو اپنا لیا ہے کہ اپنے خون کی نشانی رہے۔

رما اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ بے بس۔ چاروں طرف سے بندھنوں میں بندھی۔ زنجیروں میں جکڑی۔ کبھی کبھی بات اس کے ہونٹوں تک آ آ کر رک جاتی ہے۔ وہ اکثر فیصلہ کر لیتی ہے کہ آج وہ ضرور اس سے لڑ بیٹھے گی۔ زخموں کو نشتر لگا کر سارا مواد نکال پھینکے گی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر کہ راج کا پیار اب دوسروں کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کے بدن میں انگارے دہک اٹھتے ہیں۔ وہ ناگن کی طرح بپھر اٹھتی ہے کہ اسے ڈس لے اور نفرت کا سارا

زہراس کی رگوں میں انڈیل دے ۔۔ تاکہ وہ تڑپ اُٹھے !۔لیکن وہ کچھ نہیں کرتی! کچھ نہیں کر پاتی!! اس کے سامنے نینا کا مستقبل آجاتا ہے۔ وہ چاہے تو آج بھی راج سے ترکِ تعلق کر سکتی ہے اس کے ماں باپ اور بھائی اتنے امیر ہیں کہ راج جیسے چار چار آدمیوں کو خرید سکتے ہیں۔ لیکن وہ بھائی کو کیا منہ دکھائے گی؟ بھائی سے کیا کہے گی کہ اسی بل بوتے پر ننھی نینا کو اپنا بنایا تھا۔ ماں باپ سے جدا کیا تھا؟!

نینا اب صرف نو برس کی تھی اور چند سال بعد اس نے کچھ پوچھا تو وہ کیا جواب دے گی؟ کیا وہ راج کو کبھی بھول پائے گی؟!۔۔۔ وہ جو اس کی زندگی کا سورج ہے؟!

نہیں نہیں! وہ راج سے کہہ دے گی کہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن تم مجھ سے منہ نہ موڑنا۔۔ میں تمھارے بچے کی ماں نہ سہی، تم نینا کے پاپا تو ہو۔ اس کی لاج رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت کے دھاروں میں ہم تم بہہ جائیں اور ہماری بچی کو تنکے کا سہارا بھی نہ رہے۔

رما نے چپکے سے نینا کے گالوں پر پیار کیا اور تکیے میں سر چھپا لیا۔ ساری رات خیالات کی ندی اسے بہاتی رہی۔ ساری رات وہ تنکے کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتی رہی۔

راج اس لڑکی کو بھی اب نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ جس نے اسے اس کی آرزو کا ثمر دیا تھا۔ اور دوسری طرف رما اور نینا کا خیال بھی اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس نے کسی طرح یہ محسوس کر لیا تھا کہ رما اس کے راز سے واقف ہو چکی ہے لیکن یہ اس کی عظمت ہے کہ وہ اپنے لب سیے بیٹھی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ رما کسی دن اس سے لڑ پڑے۔ اس کے وجود کی دھجیاں بکھیر دے اسے ریزہ ریزہ کر دے تاکہ اسے سکون مل جائے۔ اپنے گناہ کے پھندے میں پھنسا قیدی بے تاب ہو رہا تھا کہ اسے جلد سے جلد سزائے موت سنا دی جائے۔ اس مسلسل کرب اور اس پیہم عذاب سے نجات مل جائے مگر مشکل یہ تھی کہ رما کے رویّے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ حیران تھا آخر یہ کیسی چٹان ہے؟ جو ذرا بھی ہل نہیں پاتی۔ وہ جان بوجھ کر رما کے لطیف جذبات کو ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ اسے دکھ دے رہا تھا کہ کسی دن یہ لاوا پھٹ پڑے۔

وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اس کی ذرا سی بھول کی سزا قدرت اتنی سخت دے گی۔ جذبات نزدیک ایک اچھے تخلیقی فن پارے کی بہی رے اٹھ دہ دے

کی ذراسی پھسلن نے اسے غاروں میں دھکیل دیا تھا۔ اس کی زندگی کا سکون لٹ گیا تھا۔ اس کے دل کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ ایک جس میں رما رہتی ہے دوسرا جس میں شوبھا زبردستی گھس آئی ہے۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ نینا اور کانت دونوں اس کا منہ تک رہے ہیں اس سے پوچھ رہے ہیں کہ "بتاؤ، ہم کیا کریں؟ ہمارا کیا قصور ہے؟"

اس کی روح زخمی اور بیمار تھی۔ وہ رما کے پاس آتا تو اس کا بے پناہ پیار، اس کا اعتماد اسے قطرہ قطرہ زہر پلانے لگتا۔ نینا کی معصوم آنکھیں کئی سوال کرنے لگتیں جنھیں دیکھ کر وہ گھبرا جاتا۔ شوبھا کے پاس پہنچتا تو لگتا کہ اس کا دل، اس کی شخصیت سب رما کے پاس رہ گئے ہیں لیکن جب ننھا کانت اس کی گود میں کھیلتا تو ایک عجیب سا سکون، ایک عجیب سی راحت اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگتی۔ اور دوسرے ہی لمحے کئی سوال ناگ کی طرح پھن اٹھائے پھنکارنے لگتے۔ اس نے شوبھا کو بیوی کا رتبہ تو دے دیا تھا مگر قانونی طور پر نہیں۔ لیکن کانت؟..... کانت تو اس کا اپنا بیٹا تھا۔ اس کی اپنی روح کا حصہ تھا۔

اس روز جب راج گھر پہنچا تو یوں لگا جیسے وہ بھولی بسری جنت میں آگیا ہو، بھولا بھٹکا راہی جب اپنی منزل پر پہنچتا ہے تو جو سکون اور طمانیت اسے ملتی ہے وہی احساس راج کو یہاں آکر ہوا۔

آج رما کے چہرے کی سنجیدگی اور بے خواب آنکھوں کی سرخی دیکھ کر وہ سہم گیا۔ اس نے سوچا جس طوفان کا وہ منتظر تھا شاید وہ طوفان آج آنے ہی والا ہے۔ اس لاوے کو اب پھٹ پڑنا چاہیئے۔ اس نے جان بوجھ کر مجرموں کی طرح کہنا شروع کیا۔

"دراصل رما میں —— میں کسی..."

"چلیے نہا دھو لیجیے... پھر باتیں ہوں گی" رما نے اس کی بات کاٹ دی۔ اور نظریں چرا کر میز صاف کرنے لگی۔ "رما! لیکن سنو! میں کسی ضروری کام سے نہیں۔ بلکہ ۔۔ بلکہ" وہ آج اپنے دل کا چور باہر نکال دینا چاہتا تھا۔

"اُفوہ۔ اب چلیے بھی۔ میں ناشتہ لگاتی ہوں۔ نینا رات کئی بار تمہیں پوچھ چکی ہے اور۔ رو رو کر سوئی ہے" رما اس طرح باتیں کر رہی تھی۔ جیسے اسے کوئی دکھ ہی نہ ہو۔

"اوہ! آئی ایم ویری سوری رما، پلیز سنو! میں ناشتہ کر آیا ہوں۔ آج تم سے کچھ کہنا ہے مجھے۔" راج نے چاہا کہ آج وہ شوبھا اور کانت کی بات کہہ کر رہے گا۔ خود سے اقبالِ جرم کر لینے سے سزا ہلکی ہو جاتی ہے۔

رما مُڑی، راج کی آنکھوں میں دیکھا اور دھیرے سے مسکرائی "مجھے بھی کچھ کہنا ہے تم سے! سنو راج! ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہماری بھول کی سزا ہمارے بچوں کو ملے گی۔ تم نینا کے پاپا ہو۔ یہ بات نینا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ تم اس کے باپ ہو۔ نینا کے اسکول کے رجسٹر میں بھی تمہارا ہی نام لکھا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ... کہ لوگ تم پر یا تمہاری بیٹی پر انگلیاں اٹھائیں۔ تم ۔۔ تم منّا کو بھی یہیں لے آؤ۔ میں۔ میں اس کی ماں ہوں راج!!"

"رما!" راج کے منہ سے ایک سسکی سی نکل گئی۔ اسے یوں لگا کہ جیسے رما نے یہ کہہ کر آسمان کی بلندیوں کو چھو لیا ہو۔ زمین کی ساری پتیاں اس کا منہ چڑا رہی ہوں۔ اس نے رما کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "رما! تم پر مجھے ناز ہے۔ میں تمہارا گنہگار ہوں رما۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

رما اپنی پلکوں پر چھلکتے آنسوؤں کو پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی! اتنے میں نینا کی آواز آئی "پاپا آپ آگئے۔! اچھے پاپا۔ آج اتوار ہے ہم پکنک پر چلیں گے۔ آج میں آپ کو کہیں جانے نہیں دوں گی" اور راج نے اسے بھی بانہوں میں بھر لیا "ہاں بیٹا! آئندہ سے ہم ہر اتوار کو پکنک پر چلیں گے۔"

"میرے پاپا! آپ کتنے اچھے ہیں۔" وہ راج سے لپٹ گئی۔

"نہیں بیٹے! اچھی تو تمہاری ممی ہیں۔ ہاں بیٹے تمہاری ممی بہت عظیم اور بہت ہی اچھی ہیں۔" راج نے محبت پاش نظروں سے رما کو دیکھا اور وہ سورج کی روشنی پا کر پھول کی طرح کھل اٹھی۔!!

OO

وعدہ میرے ہم سفر

ایک کھلکھلا کر ہنستا ہوا شوخ اور معصوم چہرہ ــــ"میری شادی ہو چکی ہے" ایک انکشاف،
"نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے" تعجب اور حیرانی ــــ
"یہ بہت پہلے ہو چکا ہے" وہ پھر ہنسی
"لیکن کب؟ ــــ کہاں؟ ــــ اور ہمیں پتہ تک نہیں" اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔
"بچپن کی بات ہے۔ میں صرف نو دس برس کی تھی۔ لڑکے کی ماں کو میں اتنا پسند آئی کہ انھوں نے مجھے لیے بغیر نہ چھوڑا۔ مجھے اپنی شادی کا دن ابھی یاد ہے" ہنسی کا فوارہ چھوٹا۔ ..."لڑکا ــــ میرا مطلب ہے تمھارے پتی کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں"؟!
"وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گئے ہیں۔ انجینئرنگ کر رہے ہیں" وہ ناز سے بولی
"تو کیا ــــ تمھاری کوئی خط و کتابت بھی ہے؟" وہ جیسے تنکے کا سہارا ڈھونڈھ رہا تھا۔ ــــ
وہ پھر ہنس پڑی ــــ "نہیں! کچھ بھی نہیں۔ ہمارے بیچ کوئی بھی پل نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ہو کر بھی اجنبی ہیں۔ ہم نے پھر کبھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا ــــ اور ــــ اور ایک دوسرے کے پتی پتنی بھی ہیں، ہے نا عجیب بات؟" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ــــ جیسے یہ سب کچھ مذاق ہو۔ جیسے بچپن میں ہوئی شادی کوئی تماشہ ہو۔ اور اب جوانی کی دہلیز پر کھڑے کھڑے کسی کی راہ تکنا ــــ آنکھوں میں سُہانے سُہانے تتلیوں جیسے رنگین سپنے سجانا ــــ اُسے بہت اچھا لگتا ہو۔
پریم نے سوچا کہ مالتی کتنی معصوم ہے۔ کتنی بھولی۔ اُسے کیا پتہ کہ بچپن کے بیاہ کا کیا انجام ہوتا ہے

بھولی بھالی لڑکیوں کو انتظار کی آگ میں جل جل کر راکھ ہونا پڑتا ہے۔ اور جب ایک ایک سپنا ٹوٹتا ہے۔ ایک ایک آشا گھایل ہوتی ہے، تب آتما کس طرح لہولہان ہوتی ہے ــــ دکھ کی چتا میں ستی ہو جاتی ہے۔ یا روز مر مر کر جلتی ہے ــــ جی جی کر مرتی ہے۔

پریم اور مالتی، ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اور اب دونوں ایک ہی ساتھ "بی ایس سی" کر رہے تھے۔ دونوں میں دوستی اور گہرا اعتماد بھی تھا۔ ایک ایسا انجانا اعتماد جس کی جڑیں دلوں میں اُتر کر کب کی مضبوط ہو چکی تھیں۔ اس روز باتوں باتوں میں مالتی نے اپنے بیاہ کی بات بتائی تو پریم کو اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی سی محسوس ہوئی تھی جیسے کانچ کی مورتی چھکے سے ٹوٹ کر بکھر گئی ہو ــــ ریزہ ریزہ ہو گئی ہو:

چمن سے اک مورتی کہیں ٹوٹی
ہاتھ یہ کس کے تھر تھرانے ہیں؟

پریم نے دیکھا کہ بکھرے شیشوں کی کرچیوں میں بھی ایک ہی تصویر مسکرا رہی ہے۔ کھلکھلا کر ہنس رہی ہے۔ مالتی کی تصویر!! اور اس کے لبوں سے ایک دبی دبی آہ نکل گئی۔ وہ جب بھی مالتی سے ملا اس کے زخمی دل پر ایک اور تازہ زخم لگا۔ ایسا لگتا وہ اپنے حال سے پوری طرح خوش ہے مطمئن ہے اُسے مستقبل کے آنے والے ہولناک دنوں کا ذرّہ بھر بھی خوف نہیں۔ کسی طوفان کا خطرہ نہیں۔ وہ حال کی پُر سکون لہروں پر دھیرے دھیرے کسی نیا کی طرح بہی جا رہی ہے۔ بہی جا رہی ہے!! پریم نے کئی بار اُسے احساس بھی دلانا چاہا "مالتی! تم نے بتایا تھا نا کہ تم ــ تم اور وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو۔ کیا اُن کے گھر والے تمھیں ملنے آیا کرتے ہیں؟" مالتی کی آنکھیں پھیل گئیں جیسے ہنس رہی ہوں۔

"ارے! تمہیں اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے۔ پٹی!" وہ اس کے گھریلو نام سے ہی مخاطب کرتی تھی ــــ اور پریم کو دل میں شیشے کی کرچیاں سی چبھتی محسوس ہو رہی تھیں "پہلے بتاؤ ــــ ورنہ میں تمھیں آج گھر جانے نہیں دوں گا۔"

"اچھا تو یہ دھمکی ہے؟!" ہرنی جیسی آنکھیں اس کی آنکھوں میں اُترنے لگیں۔

"دھمکی نہیں پگلی! ریکوئسٹ ـ REQUEST سمجھ لو۔"

"بھئی دیکھو! وہ لوگ تو میرے پپا اور ممّی کے جان پہچان کے ہیں نا! کبھی کبھار ملنے بھی آجاتے

ہیں ۔ دیوالی پر میرے لیے انھوں نے ریشمی ساڑی بھی تحفہ میں دی تھی۔ مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں پتی !" وہ لاپرواہی سے بولی

"لیکن مالتی! یہ بتاؤ ۔۔ وہ ۔۔ وہ میرا مطلب ہے کہ ان کے لڑکے سے کوئی خیر خبر نہیں آتی ؟" پریم من ہی من میں ڈرتا رہا۔

"آتی ہوگی۔ مجھے کیا معلوم" وہ لاپرواہی اپنی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔

"تمہارے والدین کیا کہتے ہیں ؟"

"کیا کہیں گے۔ بس واپسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ کب وہ آئے اور کب میرے بوجھ کو اپنے دوش سے اتار پھینکیں" پریم چپ ہوگیا۔ اب اسے کہنے کے لیے کیا رہ گیا تھا وہ تو خواہ مخواہ ہی مالتی کا پیار من میں سمائے بیٹھا تھا۔ جبکہ مالتی کو اپنے امریکن پتی کا انتظار تھا۔ مالتی ہنستی بولتی ۔۔ بھولی بھالی سی پھولوں کی طرح خوبصورت ۔ من میں کوئی کھوٹ نہیں۔ سیدھی سادی، پریم کو اتنی اچھی لگتی۔ کہ وہ چاہتا تھا جب اپنی منزل کو پالے تو اس بے مثل چاند کی ڈولی اپنے گھر آنگن میں اتارے گا! اور حسن کے اُجالے کے ساتھ گھر کو بھی روشن کرلے گا۔ لیکن مالتی کے اس راز نے اُسے اُتھل پتھل کر کے رکھ دیا تھا۔ آشا کے سارے ریشمی دھاگے الجھ گئے تھے۔ کوئی سرا ہاتھ نہ لگتا۔ وہ انھیں کیسے سلجھائے۔ جبکہ تقدیر بنانے والے نے سارے دھاگے گڈمڈ کر دیے تھے۔ اور پھر اس کے من کو لوٹنے والی بھی تو اس کے دکھ سکھ اس کے پریم کو پہچان نہیں پائی تھی۔ اور اپنے آپ میں مست مگن رہتی تھی۔ دن رات، رات رات دن پت جھڑ کے پتوں کی طرح گر گر کر مٹی اور دھول میں ملتے جا رہے تھے۔ وقت کی آندھی سوکھے پتوں کے ڈھیر کو اڑائے لیے جا رہی تھی۔ جانے کہاں ؟ جانے کس کھائی میں۔؟!

پریم ایم ایس سی کر رہا تھا۔ مالتی کو پپا نے منع کر دیا تھا وہ چاہتے تھے کہ مالتی اب اپنے پتی کا گھر سنوارے۔ وہ لڑکے کے ماں باپ سے بھی ملے" بس اب دو تین مہینوں میں وہ واپس آ رہا ہے۔ آتے ہی رخصتی کروالیں گے آپ چنتا نہ کریں۔ بہو ہماری ہے۔ جب چاہیں گے آگرے جائیں گے۔ ہم نے تو جگدیش کو لکھ دیا ہے۔"

اور وہ مطمئن ہو کر چلے آئے تھے ۔ مالتی کی کھوجتی نظریں پپا اور ممی کے چہروں کو ٹٹول کر۔ انھیں شانت اور سکھی دیکھ کر پلٹ گئیں۔ اور وہ سدا کی طرح سپنوں کی گلیوں میں کھو گئی ۔۔!!

پھر کتنے دن اور گزر گئے۔ دن ڈھل کر مہینے اور مہینوں نے سال کا لبادہ اوڑھ لیا۔ جگدیش نہیں آیا۔ ہر خط میں کوئی نہ کوئی بہانہ ۔۔۔ کوئی ٹریننگ اور تب ماں باپ کو پتہ چلا کہ وہ واپس آنا نہیں چاہتا۔ اس نے اپنے خط کے ساتھ اپنی امریکن بیوی کی تصویر بھی بھیج دی تھی۔ اور یہی اس کا فیصلہ تھا!

جیسے آسمان ٹوٹ کر دھرتی کی کوکھ پر آگرا ہو۔ دھرتی کا سینہ اس بوجھ سے پھٹ گیا۔ پارہ پارہ ہوگیا۔ ماں کی ممتا لہولہان۔ باپ کا آدرش ٹوٹا بکھرا ۔۔۔ اور زمین بوس!! وہ لڑکی والوں سے کیا کہتے؟ آنکھیں چرانے لگے۔ بہانے اور جھوٹ کا سہارا لیا۔ آخر کب تک؟ ایک دن سچائی کا چہرہ بے نقاب ہوگیا اور تب مالتی نے دیکھا کہ پتا اس سے آنکھیں نہیں ملاتے ۔۔۔ ممی نے بستر کا سہارا لے لیا۔ اس کے اپنے من کی گہرائی میں سجے سنورے سپنوں کے شیش محل چھن چھن کر کے ایک ایک ٹوٹتے رہے۔ بکھرتے رہے۔ دل زخمی۔ آشا کے پانو چھلنی ہونے لگے۔ اعتماد کی دیوار ڈھے گئی۔ ریت کی مانند بکھر گئی۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ اب کس کا سہارا ہے؟ کس کو پکاروں کیا کروں؟ کس کا ہاتھ تھاموں؟ اُسے اپنا وجود بھی گہرائیوں میں گرتا دلدلوں میں دھنستا محسوس ہو رہا تھا! آنے والے دنوں کی ہولناک آگ اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ وہ جل رہی تھی۔ بانس کے گھر کی طرح۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر آگرے گا۔ جل جل کر راکھ ہو جائے گا۔ جل بجھے گا:

لکڑی جل کوئلہ بھئی کوئلہ جل بھئی راکھ
میں پاپن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ

اُسے اپنی ہنسی یاد آئی۔ اپنی لاپروا مست مگن زندگی یاد آئی۔ پون کی طرح ڈولتی اٹھلاتی کلیوں کی طرح جھومتی مالتی یاد آئی۔ کہاں ہے وہ مالتی؟ کہاں کھوگئی ہے وہ ۔۔۔ یہ اب مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں ہنستی کیوں نہیں۔؟ میرے ہونٹ ہنسنا کیوں بھول گئے ہیں۔ کیا میں مر چکی ہوں؟ کیا میں اب صرف ایک ممی (حنوط شدہ لاش) بن کر رہ گئی ہوں۔ مجھے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ ایک عورت ایک جوانی ٹھکرادی گئی ہے۔ آج عورت کا آدرش زخمی ہے۔ جگدیش نے مالتی کو ہی نہیں بلکہ سارے مردوں نے ساری مالتیوں کو پیروں تلے روند کر اُن کی نفی کر دی ہے۔ عورت کا پیار، نفرت اور حقارت کے شعلوں میں جلا دیا گیا ہے۔ پیار! جو ہر لڑکی ہر عورت پر بہار بن کر چھاتا چلا جاتا ہے۔

پیار جو اس کے ہونٹوں کا تبسم ہے آنکھوں کی چمک اور گالوں کی دھنک ہے۔ آج اُسے اپنے پیار کی تحقیر و تذلیل پر ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے ماتھے کی بندیا کسی نے نوچ کر پیروں تلے مسَل ڈالی ہو۔ اس کی مانگ کا سیندور مٹی میں ملا دیا ہو۔ اس کا دل بھر بھر آیا۔ ایک چیخ سی اس کے ہونٹوں پر آ کر دم توڑ گئی۔ آنسو چھلک آئے لیکن اس نے ضبط کی دیواریں یوں کھڑی کر دیں کہ ایک بھی آنسو پلکوں سے ٹپک نہ پایا! اس نے اپنے آنسو اپنے من میں اُتار لیے نہیں نہیں۔ میں نہیں روؤنگی۔ نہیں روؤنگی۔ مجھے تو ہنسنا ہے۔ میں ہنستی رہوں گی۔ میری ہنسی پر کسی کا اختیار نہیں ہے۔ نہیں ــــ اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اور ابھی ابھی وہ "ایم۔ ایس سی" کی سائنس کی کلاس اٹنڈ کر کے باہر نکلی تو سامنے ہی اُسے پریم مل گیا۔ "تم ــــ تم مالتی۔ یہاں" حیران حیران آنکھیں اپنے محبوب کو سامنے پا کر جھوم اُٹھیں جیسے بت جھڑ میں ساون آ گیا ہو۔

"ہاں پریم! میں نے داخلہ لے لیا ہے۔ ایم۔ ایس سی کروں‌گی۔ پھر۔ پی۔ ایچ ڈی۔" وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب پر نظر جما کر بولی۔

"پھر۔ ؟" اس نے سانس روک کر پوچھا ــــ "پھر ؟!" وہ مسکرانے لگی۔ "پھر سروس کروں گی لڑکیوں کو پڑھاؤں گی۔ زندگی پتھریلی راہوں پر آگے بڑھاؤں گی ــــ یوں میری بھی زندگی بیکار تو نہ جائے گی نا ــــ!"

"مالتی ؟ کیا کہہ رہی ہو تم۔ میں سمجھا نہیں۔ وہ۔ وہ"

"پٹّی ــ ! یہی پوچھنا چاہتے ہو نا کہ ــــ وہ تمہارا فارن والا ہسبینڈ کیا ہوا ؟" وہ خوش دلی سے ہنس پڑی۔ "تو سنو ــــ مجھے کوئی دکھ نہیں پٹّی کہ اُس نے امریکن لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اور وہیں پر بس گیا ہے۔" وہ لاپرواہی سے اپنی چوڑیاں گھما رہی تھی۔

پریم کے من میں پڑے پڑے اندیشوں کے ناگ نے پھنکارا۔ کرچیاں اُسے بھرے لہو لہان کر گئیں۔ "اوہ! آئی ایم سوری مالتی۔ میں۔ میں اسی دن کے لیے ڈرتا تھا۔" اس کا لہجہ بڑا زخمی تھا ــــ مالتی نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا!

کتنا پیارا آدمی ہے یہ پریم بھی! میرے آنے والے دنوں سے ڈرتا رہا۔ جبکہ میں خود لاپرواہی رہی ــــ اس کے لبوں پر گھایل مسکان آ گئی۔

"ایک بات کہوں مالتی! اگر تم برا نہ مانو ــــ تو" پریم کا چہرہ امید کی کرنوں سے روشن تھا۔

"تمہاری بات کا بُرا ماننا کیا۔ کہو۔!"

"تم۔ تم بھلے ہی ایم ایس سی کرو! ــــ پھر پی ایچ۔ ڈی۔ پھر سروس بھی کرنا ــــ
ــــ لیکن ــــ جیون کی اس راہ میں۔ میں تمہارا ہم سفر رہوں گا تم تنہا نہیں رہو گی مالتی۔ تم تنہا کبھی، نہیں تھیں مالتی!!" اس کی آواز بھرا گئی۔

"پم ــــ پی ــــ پی! ۔ یہ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"وہی جو بہت پہلے کہنا چاہتا تھا۔! وعدہ کرو کہ اب تم۔ تم کسی کا بھی انتظار نہیں کرو گی۔ سوائے میرے۔!" پریم کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ آنکھوں میں آس کے دیپ جگمگا رہے تھے۔ اس نے پیار بھری بھرپور نگاہوں سے مالتی کو دیکھا۔ نظریں چار ہوئیں۔ مالتی کے ہونٹوں پر کپکپاہٹ سی اُبھری۔ ماتھے پر ننھی ننھی پسینے کی بوندیں جھلملائیں گالوں پر پیار کا گلال سا گھل گیا۔ کچھ دیر کی خموشی کے بعد وہ دھیرے سے سر جھکا کر بولی۔

"وعدہ۔ میرے ہم سفر ــــ!!"

OO

کرب کی صلیب

مجھے نہیں معلوم دولھا کس کو کہتے ہیں، مگر سب کی زبان سے سن سن کر اتنا ضرور جان گئی ہوں کہ میرا دولھا پردیس میں ہے۔ میں نے جب سنا کہ سارے لوگ "دولھا آگیا" کی رٹ لگاتے ادھر سے ادھر جھانکنے لگے تو دھکم پیل کی پروا نہ کرتے ہوئے لوگوں کے بیچ گھس کر میں نے بھی آخر دولھا کو دیکھ لیا تھا اور امی سے پوچھ بیٹھی "کیا یہی میرا دولھا ہے؟" آس پاس کھڑے لوگ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگے۔ امی نے مجھے بُری طرح ڈانٹا۔

"بے شرم! دولھا کا نام زبان پر لاتی ہے۔ خبردار جو دوبارہ کبھی کہا۔"

اور میرے ننھے سے دل میں دولھا کو دیکھ کر جو ایک پیاری سی عجیب سی کرن پھوٹی تھی ڈانٹ پھٹکار کے ملبے تلے دب کر بیٹھ گئی۔ ہا۔! دولھا۔!!

ابھی میری آنکھوں کے آئینے میں جگمگ جگمگ کرتا ایک رُوپ سمایا ہوا ہے۔ سر سے پیر تک مہکتے ہوئے کچّی کلیوں میں سجا۔ سر پہ زرتار صاف زربفت شیروانی، سفید چوڑی دار پاجامہ اور چمکتے جوتے۔ جیسے خوشبوؤں اور رنگوں کا ایک طوفان ہو۔ ہونٹوں پر شوخ تبسم۔ سُرمہ سی آنکھوں میں چمک۔ جیسے کچھ بھول رہی ہو۔ آج بھی بچپن میں دیکھا ہوا وہ منظر یاد آتا ہے تو ایک عجیب سا مُنہ بند احساس جاگ اُٹھتا ہے۔ فوراً ہی امی کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور میں بالکل ننھی بچّی کی طرح سہم اُٹھتی ہوں۔

کتنے دن گزر گئے، دن نہیں سال۔ سال بھی نہیں، شاید پوری عمر وہی خواب۔ وہی

ایک سجا دھجا روپ آنکھوں میں سماتا رہا۔ دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتا رہا۔ ہونٹوں پر کپکپاتا رہا اور کنواری آنکھوں کی چلمنوں کے پیچھے مسکراتا رہا۔ دولھا!

عمر بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگتی جا رہی ہے۔ بچپن میں دولھا دیکھنے کی اور اس کے متعلق زبان کھولنے کی تو جرأت کر لی تھی۔

مگر بچپن کے بعد یہ شوق، یہ سوال دل کے نہاں خانوں میں بند رکھا۔ اندر ہی اندر اسے دفن کرتی رہی کہ کہیں منہ پھٹ بن کر کچھ پوچھ نہ بیٹھوں اور امّی ڈانٹ دیں، تب مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ بچپن کے معصوم اور انجان لمحوں میں کسی کے دامن سے کیوں باندھ دیا تھا جب کہ مجھے اس کا نام تک معلوم نہ تھا لیکن جوں جوں بڑی ہوتی گئی رفتہ رفتہ یہ پتہ چل گیا کہ مجھے اپنے دادا مرحوم کی اُکھڑتی سانسوں کی بیچ قربان کیا گیا تھا کہ ان کی رُوح کو تسکین ملے اور وہ ساتھ کوئی حسرت لے کر نہ جائیں۔ میں تب کوئی پانچ سال کی گڑیا تھی جبکہ دادا ابّا کے دوست کے بیٹے سے میرا نکاح پڑھوا دیا گیا تھا۔ میری دائی ماں کہتی ہے کہ بیٹا تجھے گڑیا گڈا بھی کھیلنا نہ آتا تھا۔ جب دُلہن بنایا تھا۔ ہاں تجھے لال جوڑا پہنا کر زیور اور پھولوں سے سجایا سنوارا تھا اور اکرم میاں کوئی آٹھ سال کے تھے۔ ان کو بھی زرتار لباس اور پھولوں کے ہار گجرے پہنائے اور باقاعدہ تیرا نکاح ہوا تھا۔ احباب کی ضیافت ہوئی۔ ہاں رخصتی نہیں کی۔ اس کے لیے یہ طے کیا گیا کہ جب تو بڑی ہو جائے گی اور اکرم میاں پڑھ لکھ کر لائق ہو جائیں گے تب رخصتی کریں گے۔ یوں تیرے دادا چند گھنٹوں بعد خدا سے جا ملے، جیسے تیرا فرض پورا کرنے ہی میں جان اٹکی تھی۔

اور میں سُن سی بیٹھی پھٹی آنکھوں سے بچپن کے اس منظر کے ٹکڑے جمع کر کے مجسّم دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دائی ماں کہتی جاتی ——

"پھر بیٹا! وہ لوگ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ برسوں کسی کی خبر نہ ملی پھر بہت دن بعد پتہ چلا کہ وہ پاکستان میں ہیں۔ جلد ہی حالات ٹھیک ہونے پر تمھیں لینے بھی آئیں گے۔" دائی ماں مجھے ماں سے بڑھ کر لگتیں جس نے کم از کم مجھے اس بات سے آگاہ تو کر دیا کہ کیسے اور کیوں مجھے سولی پر چڑھایا گیا تھا، ورنہ برسوں صلیب پر ٹنگی رہ کر بھی مجھے یہ پتا

تک نہیں چلتا کہ میں یہاں کس لیے مصلوب ہوں! اب اتنا تو جان گئی تھی کہ چند دقیانوسی خیالات کے لوگوں کی بے معنی اور قاتل خواہشوں کی خاطر ایک ننھا سا وجود زندہ درگور کر دیا ہے۔ وہ وجود آج بڑھ کر اونچا اور پوری زندگی کی حرارت سے تڑپتا ہوا جوانی کا ایک مُرقع بن گیا ہے۔ پھر دائی ماں حق سے جا ملیں اور بٹیا کی رُخصتی کا ارمان لیتی گئیں۔ میں بہت دن روئی۔ ایک ہمدرد، غم گسار مجھ سے جُدا ہو گیا تھا۔ امّی سے لڑ جھگڑ کر میں نے بی۔ ایس۔ سی کے بعد ایم۔ ایس۔ سی میں داخلہ لے لیا۔ ابّا جی کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ہم کیا کر رہے ہیں ——— انھیں تو بس شکار کی لت تھی۔ دوست احباب کو دعوتیں دینے کا جنون تھا، مہینوں گھر سے باہر رہتے شکار کے لیے ہزاروں روپیہ خرچ کر ڈالتے اور ہفتوں جنگل میں ڈیرا ڈالے مزے اڑاتے۔ میں بڑی لڑکی ہوں۔ نشو چھوٹی ہے۔ ابھی میرا فرض ہی پورا نہ ہوا تو نشو کا کب ہوگا۔ نشو بھی میرے قدم سے قدم ملا کر چلنے کو تیار کھڑی ہے۔ میں یونیورسٹی کی ذہین طالبہ ہوں۔ اپنے آپ پر ناز بھی کر سکتی ہوں کہ قدرت نے ایک حسین ترین وجود میں مجھے ڈھالا ہے۔

شاید اسی خوش فہمی میں مبتلا ہو کر میں کچھ خودسر اور خوددار بھی واقع ہوئی ہوں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ کسی کو لفٹ نہیں دیتی۔ نوجوان لڑکے مجھ سے ہنس بولنے کو ایمان سمجھتے ہیں۔ میں ان سے بات چیت صرف اس حد تک ہی رکھتی ہوں کہ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ سہیل یونس، اکرم ــ یہ سب ہی ایم۔ ایس۔ سی کے ذہین اور سمارٹ طلباء ہیں۔ مجھ سے بڑے مخلص بھی ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی دل کے سنگھاسن پر بٹھا نہیں پاتی۔ کسی کی معنی خیز مسکراہٹ کا جواب مسکرا کر نہیں دے سکتی۔

اس لمحے شاید کہیں دُور ذہن و دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کوئی یاد جاگ اُٹھتی ہے کہ میں کسی کی امانت ہوں۔ میرا پیار، میری توجہ کسی اور کے لیے ہے۔ وہ جو میرا دولھا ہے، اور تب میں ایک شانِ بے نیازی سے گزر جاتی ہوں۔ اعتماد کی ریشمی ڈور میں بندھی بندھی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہوں کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔

عمر بند مٹھی سے پھسلتی ریت کے مانند بکھرتی چلی جا رہی ہے۔ جوانی کے گلابی لمحوں میں اس کا احساس بھی نہ ہوا کہ واقعی عمر ڈھل رہی ہے۔ ابّا جی کی زندگی میں کچھ رشتے میرے لیے ضرور آئے

عمدہ اور طرح دار .... انھوں نے امّی کو سمجھایا کہ بیگم کب تک راہ دیکھیں گے .... کسی کے گھر اس کی ڈولی اُتارنی ہی ہے۔ چلو اُن میں سے کسی کو منتخب کر لیں۔" لیکن امّی کو جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ وہ بُری طرح چیخیں چلّائیں کہ توبہ میرے آگے پھر یہ بات نہ کرنا۔ شمّی کسی کی امانت ہے۔ اس کا دولھا سلامت ہے وہ آئے اور لے جائے۔ کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ منکوحہ لڑکی کو دوبارہ بیاہ دیں۔ یوں شیروں کی گرج پر نڈر ہو کر گولی چلا دینے والے ابّا جی بیوی کے آگے نرم پڑ جاتے اور بات ٹل جاتی۔ وقت کی لگام کس نے تھامی ہے۔ ابّا جی شکار، دوستوں اور دعوتوں سے تھک کر ابدی نیند سو گئے۔

امّی کو ذرا ہوش آیا ــــ میجر شاہد کا رشتہ نشو کے لیے طے کر دیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس شاک سے سنبھلتی وہ دُلہن بنا دی گئی، اور میرے سامنے میری چھوٹی بہن اپنے دولھا کا ہاتھ تھام کر روتی، سسکتی سسرال چلی گئی اور مجھے تب ہوش آیا جب ساری گہما گہمی ختم ہو چکی تھی اور میرے سامنے طویل جلتی شاہراہیں اپنی باہیں پسارے کھڑی ہیں۔ یوں تو میں اپنی سروس پر لگ چکی ہوں، ماہانہ ایک ہزار روپے تک کما لیتی ہوں۔

لیکن زندگی اور کچھ تو مانگتی ہے! دوست احباب کی چبھتی ہوئی طنزیہ نگاہوں سے فرار حاصل کر کے میں امّی کو لے کر دُور اس شہر میں آ گئی ہوں، جہاں لڑکیوں کے کالج میں میرا تبادلہ ہوا ہے۔ سارا دن مصروف رہتی ہوں۔ رات کو بھی نیند آنے تک کتابوں میں کھوئی ہوئی اپنے ذہن و دل کو بھٹکنے سے روکتی ہوں لیکن شاید امّی کو میری بے کسی کا احساس اب ستانے لگا ہے۔ وہ بیمار رہنے لگی ہے۔ میرے دل کے اندھیرے ان کی آنکھوں میں اُتر آئے ہیں۔

ان ہی دنوں ہماری ملاقات ایک اچھے خاندان سے ہو گئی ہے۔ جو ہمارے پڑوسی ہیں امّی کی آنٹی سے دوستی ہو گئی۔ انھوں نے اپنے لڑکے ڈاکٹر عدنان کے لیے میرا رشتہ مانگا ہے، جو مڈل ایسٹ میں دس بارہ ہزار کما رہا ہے۔ میری آنکھوں میں اَدھ کھلے کنول جھومنے لگے۔ دل بات بات پر کسی خوب صورت دُھن کی طرح دھک دھک کرنے لگا ہے۔ سپنوں کی گلیوں میں دیوالی کے دیے جگمگ جگمگ کرنے لگے ہیں۔ جن کی ننھی پیاری پیاری روشنی میرے

مَن کے آنگن میں اُجالا بکھرنے لگی ہے اور میں گنگناتی 'جھومتی' بہاروں کی شاخِ گُل سی بن جاتی ہوں کہ میرے آنگن برات اترنے کو ہے۔ مُنہ بند آشائیں اب کھلنے کو ہیں۔

آنٹی نے چپکے سے مجھے عدنان کی فوٹو دکھا دی تھی "شمی! دیکھ یہ تیرا دولہا ہے' جیسا نام ویسا ہی انسان ہے۔ ہے نا؟" اتنا شان دار۔ اتنا اسمارٹ کہ بس دل دھک سے ہوگیا۔ تصویر کی آنکھوں میں مجھے وہی شوخی' وہی مسکراہٹ نظر آئی جو بچپن میں کہیں دیکھی تھی!

ایک پل کو میں کھوسی گئی۔ تب آنٹی نے پوچھ ہی لیا۔ "پسند آیا نا! ہے نا تیرے قابل!؟ اری تُو تو ایسے شرما رہی ہے جیسے کوئی گنوار لڑکی۔"

میں واقعی بُری طرح شرما گئی تھی۔ انھوں نے میرا ماتھا چوم لیا اور کہا۔

"بیٹی! میں جانتی ہوں کہ تو انکار نہ کرے گی۔ عدنان بڑا پیارا انسان ہے وہ تیری قدر کرے گا اور تجھے خوش رکھے گا' تیری امّی نے بھی ہاں کر دی ہے۔!!"

اور میرے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی ـــ "دولہا"

اور کچھ دن بعد عدنان آ گئے۔ دراز قامت' وجیہہ اور خوش اخلاق.....

"ہلو!ـــ کیا آپ آسمانوں کی شہزادی ہیں؟" انھوں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ مجھ سے فوراً ہی کوئی جواب نہ بن پڑا تو دوسرا تیر پھینکا۔

"آپ کی آسمانی زبان کون سی ہے؟"

اور میں سنبھل کر بولی ـــ "جو دلوں کی ہوتی ہے۔" اور عدنان حیران حیران سا بڑی بڑی بولتی آنکھوں سے مسکرا کر یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی اچنبھا ہو گیا ہو۔ پھر بڑے پیار سے میرا ہاتھ تھام کر ہونٹوں تک لے گئے اور مہرِ محبت ثبت کر دی ـــ "مجھے ساری عمر آپ کی ہی تلاش رہی۔ کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا ـــ شکر خدا کا کہ آج تلاش ختم ہوئی۔"

اور میرا دل کامیابیوں کے ہنڈولوں میں آسمانوں کو چھو آیا۔ میری پلکیں بھیگنے' لب کپکپانے لگے۔ میں اتنا ہی کہہ پائی ـــ

"کہیں آپ کو خوش فہمی نہ ہو؟"

"نہیں' ایسا نہ کہیے۔ منزلیں جب ملتی ہیں تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ آپ میری منزل

ہیں، اور اب میں کبھی بھی بھٹک نہیں سکتا۔"

اور میں نے اپنی منزل کے شانے پر سر ٹیک دیا۔!

اس رات میرا بستر چیونٹیوں سے بھر گیا۔ نظر نہ آنے والی چیونٹیاں جو روم روم کو ڈسے جا رہی تھیں۔ میں ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔ ایک احساسِ جرم سا تھا۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ عدنان کی شخصیت کے سحر میں ڈوب کر کسی کی امانت میں خیانت کر رہی ہوں ــــ میں کسی کی منکوحہ ہوں ــــ مجھے اتنا بے قابو نہیں ہونا چاہیے۔.....

لیکن کب تک؟ وہ میرا امین ہے کہاں ــ؟ وہ میرا ہاتھ تھامنے آتا کیوں نہیں۔ میں کب تک اس کی راہ تکوں؟ وہ جس کا پتا نہیں ہے۔ کیا اس کے نام پر یہ زندگی کاٹ دوں؟ میں پر سزا کیوں بھگتوں، جبکہ جرم میں نے نہیں کیا۔ اُف! میں کیا کروں؟ رات میرے لیے صلیب سے کم نہ تھی۔

صبح میری آنکھیں سُوجی سُوجی تھیں۔ امّی بھی مجھ سے آنکھیں چُراتی رہیں ــــ وہ بھی تو اس جرم میں شریک ہیں، جس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔ میں جو صلیب پر لٹکی زندگی اور موت سے اُلجھ رہی ہوں۔ وقت اور مجبوری نے امّی کو عاجز بنا دیا ہے۔ میں انھیں دُکھ بھی تو نہیں دے سکتی۔

میرا رشتہ عدنان سے پکا ہو چکا ہے۔ بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آنٹی اور امّی چاہتی ہیں کہ ہفتہ بھر بعد ہی بیاہ کر دیں، تاکہ عدنان مجھے لے کر سیر و تفریح کر سکیں اور اگلے ماہ انھیں واپس جانا ہے۔

اس شام میں نے عدنان کے نام ایک رقعہ لکھا اور چپکے سے انھیں بھجوا دیا۔ رات بھر اپنے ہی ہاتھوں ٹوٹے ہوئے آئینوں کو جوڑنے کی کوشش کرتی رہی۔ بکھرے موتی سمیٹتی رہی۔ یہ جانتے ہوئے کہ مالا ٹوٹ گئی۔ اب پھر بن نہ پائے گی۔ صبح کی پہلی کرن میری آنکھوں میں کانچ کی

طرح چبھنے لگی۔ میں صبح کے ڈر سے آنکھیں چرانے لگی کہ اب زندگی اندھیروں کی گپھاؤں میں روپوشی ہونے کو ہے۔ دل ایک اُجڑے مندر کی طرح ویران ہے۔ ہوا سائیں سائیں چل رہی ہے۔ سارے دیپ جھلملا کر بجھ گئے ہیں۔ اب کس کا انتظار ہے۔ اب کون آئے گا۔؟

تب بہاروں کی چال چلتے عدنان اداس اور بھیگی آنکھیں لیے میرے کمرے میں چلے آئے۔ میں نظریں جھکانے لگی ہوں کیسے ملاؤں ؟

" آپ واقعی آسمانوں کی شہزادی ہیں۔ میں نے ٹھیک کہا تھا۔"

میرا دل دھڑکنیں بھول رہا ہے۔ میں چپ ہوں۔

" آپ واقعی اتنی ہی بلند ہیں کہ میں آپ کو چھو نہیں سکتا۔! ہاں شمّی ! آپ نے یہ رقعہ لکھ کر اپنے بچپن کے ایک راز سے پردہ اٹھا کر مجھے حیران کر دیا ہے۔ میں رات بھر سو نہ سکا۔ ہاں واقعی"

میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔

عدنان نے پھر کہا۔ لیکن نئے انداز میں۔" تم ۔ تم ۔ کتنی بلند کردار ہو۔ ساری زندگی ایثار کیا۔ اور جب کہ سہاگ کی مہندی رچانے والی ہو تو چاہتی ہو کہ ارمانوں کے خون سے ہتھیلیاں لال کر لو۔ چاہتی ہو کہ میں تم سے بیاہ نہ کروں لوٹ جاؤں ؟"

" عدنان ۔" میرے بھرے گلے سے اتنا ہی نکل سکا۔

" نہیں شمّی ! میں تمھیں تنہا اُداس اور فرسودہ رسم کی بھینٹ نہ چڑھنے دوں گا، جو بزرگوں نے اپنی خوشی کے لیے کی تھی۔ میں تم ہی سے بیاہ کروں گا شمّی ! تم میری ہو۔ میری ہی رہو گی !"

اور میرے ڈگمگاتے قدموں کو عدنان نے سنبھال لیا ہے۔ تب آنٹی نے بتایا کہ عدنان ان کے بھائی انوار الحق کا لڑکا ہے جو پاکستان ہجرت کرنے کے بعد گزر گئے۔ ماں بھی نہ رہیں تو آنٹی نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ تعلیم دلائی اور اب وہ مڈل ایسٹ میں مقیم ہیں۔ امّی نے بھی سسکیوں کے بیچ انھیں ساری کہانی سنا دی جیسے وہ کوئی الف لیلوی داستان ہو۔" عدنان ہی اکرم عدنان ہیں ۔"

آنسوؤں بھری آنکھوں سے میں نے انھیں دیکھا۔ وہ مجھے ویسے ہی نظر آئے۔ دراز قامت، شوخ پھولوں میں بسے۔ بچپن کی ایک برات کے دولھا ــــ اور میں ــ میری آنکھوں سے چھم چھم آنسو برسنے لگے۔

○○

ریت کی دِیوار

"انو! آج میں نے اپنے نئے سپرنٹنڈنٹ مسٹر مہتہ کو کھانے پر مدعو کیا ہے۔ بارہ بجے تک انتظام کر سکوں گی؟" وہ ٹائی کی گرہ باندھتے ہوئے بولا۔

انو رادھا کافی میں چینی ملاتے ہوئے رک کر بولی "کوشش کرونگی۔ کیا کیا ڈش چاہیئے؟" روی نے اس کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھا "بھئی! اب یہ تمہاری مرضی۔ تم تو ایکسپرٹ ہو نا پکوان میں ... ویسے ذرا اسپیشل ڈش ہو تو اچھا رہے گا۔ ایک میٹھی ڈش بھی بنا دینا۔" انو نے کافی کا پیالہ آگے بڑھا دیا "خوشامد کرنا کوئی تم سے سیکھے۔ پہلے تعریف کے پُل باندھتے ہو پھر فرمائش کے۔"

وہ مسکرانے لگا "اچھا! تم سامان کی لسٹ بنا دو، کسی کے ہاتھ بھجوا دونگا۔" اُس نے جلدی جلدی گھونٹ بھرے۔ انو نے اسکوٹر کے باکس میں تھیلا رکھ دیا۔ اور سلپ پکڑاتے ہوئے بولی "نو بج رہے ہیں۔ جلدی سے سامان بھجوا دینا!"

"انو ڈارلنگ! ٹھیک بارہ بجے مسٹر مہتہ کو لے کر آجاؤنگا۔ سارا انتظام مکمل رہے۔ اور ہاں سنو! رانی جی آپ بھی ذرا ٹیپ ٹاپ رہیں۔ بے بی کو بٹروس میں دے دو۔ وہ کچھ دیر سنبھال لیں گے۔"

وہ بناوٹی غصے سے بولی "ہاں! آئے دن دعوتیں سوجھتی ہیں۔ کیا فائدہ ہو رہا ہے؟ یہی نا کہ ہر مہینے خرچ بڑھ جاتا ہے۔ ایک نوکر تک کا انتظام نہیں ہو سکتا۔"

"گھبراؤ نہیں انورانی! اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کوارٹر بھی مل جائے گا۔ اور نوکر چاکر بھی۔ ذرا اس نئے آفیسر کو خوش کر دیں پھر دیکھنا" وہ مسکرانے لگی۔ روی اسکوٹر اسٹارٹ کر چکا تھا۔ بے بی ڈگمگاتے قدموں سے دروازے پر آگئی۔ تاتا۔ تاتا! اُس نے اپنا ننھا سا ہاتھ ہلا دیا۔ "ٹاٹا۔ بائی!" وہ ہنستا ہوا آگے نکل گیا۔

انو رادھا بے بی کو تیار کر کے بڑوس والی آنٹی کے پاس چھوڑ آئی۔ دریچے اور دروازوں کے پردے بدلے۔ فرنیچر پونچھا۔ گلدان میں تازہ پھول سجائے۔ اور ننھے سے مرادآبادی گلدان میں رکھی امر بیل کا پانی بدلتے ہوئے اک پل کو زیر لب مسکرائی.... وہاں ننھی منی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ایک خیال سورج کی کرن کی طرح چمکا۔ شاید سچ کہتے ہیں کہ جہاں امر بیل اچھی طرح پھولے وہاں روپئے پیسے کی ریل پیل ہوتی ہے۔ تو اب ہماری الجھنیں بھی ختم ہونے کو ہیں جب سے روی کا تبادلہ اس جگہ ہوا تھا۔ زندگی پہ پریشانیوں کے گہرے بادل گھر آئے تھے۔ ابھی تک کوارٹر بھی نہیں ملا تھا اور نہ کوئی نوکر ہی۔ وہ اس چھوٹے سے کرایے کے مکان میں رہ رہے تھے جہاں کوئی سہولت نہ تھی وہ جب بھی گلہ کرتی۔ روی اُسے تسلّی دلا دیتا "بھئی اب چند دنوں کی تو بات ہے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"

اور آج ایک نئی اُمنگ کے ساتھ اُس نے سارا انتظام کیا۔ ڈنر ٹیبل سجا کر ہاتھ منہ دھوئے اور ہلکی سی آسمانی شیفون کی ساڑی پہن کر بے بی کو لے آئی۔

"اونہہ! بے بی کو سنبھالنے کے لیے بھی کوئی آیا نہیں رکھ سکتے" اُس نے دل ہی دل میں بڑبڑاتے ہوئے دودھ کی بوتل بے بی کے منہ سے لگا دی۔ تب ہی جیب کا ہارن گونج اُٹھا۔ دوسرے لمحے برآمدے میں قدموں کی چاپ اور آوازیں سنائی دیں۔

"انو۔ ارے بھئی! کہاں ہو؟" روی سیدھے بیڈ روم میں چلا آیا۔

"آگئے" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں! ۔ کھانا تیار ہے؟" وہ جوتے نکالتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی"

"گڈ! اسی ادا نے تو مارا ہے ڈارلنگ! اچھا چلو مسٹر مہتہ سے ملواؤں، پھر کھانا پروس دینا"

"خواہ مخواہ میں کیوں ملوں کسی سے!!" وہ منہ بنا کر بولی۔

"بس! اسی کا نام اخلاق ہے؟ چلو۔ اس میں بُرائی بھی کیا ہے :" اُس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔۔ اور وہ روی کے پیچھے سر پر آنچل جمائے بر آمدے میں چلی آئی۔ نمستے کہتے ہوئے جوں ہی اس کی نظریں اُٹھیں۔ سامنے اشوک بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ "ہلو۔۔ کیسی ہو؟"

"ارے۔ آپ۔ آپ کب آئے؟" وہ بوکھلائی۔

"تم جب دیکھ رہی ہو :" اشوک کے لبوں پر شوخ مسکان تھی،

"ڈیڈی نہیں آئی؟ اور آپ نے اطلاع بھی نہیں دی :"

"روی تو جانتا تھا!" ۔۔ اور اُس نے حیرت سے روی کی جانب دیکھا وہ اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ بھئی دراصل۔ ہم دونوں چاہتے تھے کہ آج تمہیں ذرا سرپرائز کریں گے۔ اس طرح کسی کو اچانک دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے نا!؟"

"اوہ!" اس کے لب کپکپائے۔ اُس کے چہرے پر جانے کونسا رنگ چھلک آیا۔

"او۔ انو! آج کی دعوت مسٹر اشوک مہتہ ہی کے اعزاز میں ہے :"

روی گمبھیرتا سے بولا۔ اور اشوک اپنی مخصوص گونجیلی ہنسی ہنس پڑا۔ "تمہیں ضرور دکھ ہوگا کہ اتنی تکلیف بیکار ہی اُٹھائی۔ کیوں؟" اس نے ایک نظر روی پر دوسری اشوک پر ڈالی اور خفگی سے بولی۔ "اچھا تو دونوں کی ملی جلی اسکیم ہے۔ آج دونوں کو کھانا نہیں ملے گا سزا کے طور پر۔"! ۔۔ "آؤ اشوک! تمہارا ہی گھر ہے۔ خود بھی نکال کر کھا سکتے ہو۔۔"

روی ہنستا ہوا اندر چلا گیا۔ انورادھا کے قدم جہاں کے تہاں جم گئے۔

"میرے آنے سے تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟" اشوک نے پوچھا۔ اور وہ دھیمی ہنسی ہنس پڑی۔ "بھلا یہ بھی کوئی سوال ہے!!" اور تیزی سے اندر چلی گئی۔۔

رات بستر پر لیٹے لیٹے روی بولا۔ "تم نے اشوک کو گھر پر ٹھہرنے کو نہیں کہا۔ کیوں؟" وہ پاس ہی بے بی کو تھپک کر سلا رہی تھی۔ چونکی۔ ایک پل کو چہرے کا رنگ بدلا۔ دھیرے سے بولی۔ "نہیں کہا۔۔ کیوں؟!"

"اس لیے کہ پہلی بار ہمارے گھر پر آیا ہے۔ اور تم نے اُسے ٹھہرنے تک کو نہیں کہا۔ کیا سوچا ہوگا اُس نے!؟"

"کچھ نہیں سوچیں گے۔ کیا انھوں نے اتنا چھوٹا سا مکان دیکھ کر اندازہ نہیں لگایا ہوگا؟"

"پھر بھی ڈیر! ایٹی کیٹ کس کو کہتے ہیں۔ وہ یہاں "ٹی۔ بی" میں ٹھہرا ہوا ہے نیا شہر نئی جگہ۔ ایسے میں ہم یہاں رہتے ہوئے ......؟"

"تم ہی کہہ دیتے!"

"میں نے کہا ضرور تھا۔ لیکن وہ نہیں مانا!"

"اچھا کیا۔" اُس نے مختصر سا جواب دیا اور تکیے سے سر لگا دیا۔ روی نے اس کا ہاتھ تھام لیا" خفا ہو ڈارلنگ!؟"

اس نے روی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مسکرائی "نہیں ڈیر! بھلا اپنے دیوتا سے خفا ہو سکتی ہوں۔" اور یہ کہتے ہوئے روی کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

اشوک کبھی کبھی روی کے ساتھ گھر چلا آتا۔ روی اس کی بہت خاطر تواضع کیا کرتا۔ دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ اتنے دنوں وطن سے دور رہا اور جب بھی سال میں ایک دو بار سسرال جاتا تو وہاں اشوک سے ملاقات ہو جاتی۔ رات گئے تک باتیں کرتے۔ تاش کی بازیاں لگتیں۔ سگریٹ پھونکتے اور قہقہے لگتے۔ اور اب اچانک اشوک اس کا سپرنٹنڈنٹ بن کر یہاں آگیا تو روی کی خوشی کی انتہا نہ رہی! اس کی میزبانی کا یہ پہلا موقع تھا وہ کوئی کسر نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ انو سے اشوک کے پسندیدہ کھانے تیار کرواتا اور اصرار کر کر کے کھلاتا "بھئی ہماری انورانی بہترین کھانے بناتی ہیں۔ شاید ہی دیدی نے کبھی ایسا کھانا تمھیں کھلایا ہو۔" اور اشوک کے چہرے پر سایہ سا گزر جاتا۔ وہ زور دار قہقہہ لگاتا "خوب کہی تم نے! بھلا شیلا کیا جانے گھر گرہستی — اور وہ بھی کچن میں جاتے ہوئے اُس کا دم نکلتا ہے۔" اشوک یہاں آکر محسوس کر رہا تھا کہ جیسے کسی بھولی بسری جنت میں آگیا ہو۔

اس روز اشوک نے بے بی کے سامنے کھلونوں اور کپڑوں کے پیکٹ ڈال دیے وہ انکل انکل کی رٹ لگا رہی تھی۔ انو رادھا چائے کی ٹرے لے کر اندر آئی اور ٹھٹک گئی — اُس کی آنکھوں میں ایک کرن سی لہرائی۔ دوسرے ہی لمحے وہاں کوئی سیاہ بادل سا چھا گیا۔

کانپتے ہاتھوں سے چائے بنا کر دیتے ہوئے بولی: "خواہ مخواہ کیوں تکلیف اُٹھائی؟"

اشوک یوں چونکا جیسے کوئی نوکیلا کانٹا چبھ گیا ہو۔ حسرت بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا: "کیا یہ بے بی کا حق نہ تھا؟" وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

"اب آپ روز روز لایا کریں گے۔ یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔"

"اشوک کوئی غیر تو نہیں انو!؟" روی بولا اور آنکھوں آنکھوں میں انورادھا کو ڈانٹا۔ اُس نے سر جھکا لیا ــــ اشوک خوش دلی سے بولا "بھئی تم دونوں ہمارے بیچ دخل نہ دو۔ یہ میرا اور بے بی کا معاملہ ہے۔ کیوں گڑیا؟" بے بی اطمینان سے اس کی گود میں بیٹھی کھلونوں سے کھیل رہی تھی "انکل ہم تو لوز کھلونے لانا!" اور انورادھا باوجود ضبط کے ہنس پڑی۔ اشوک کھِل اُٹھا۔

روی کو اب اطمینان ہو چلا تھا کہ اب اس کی کئی الجھنیں سلجھ گئی تھیں۔ صبح اشوک نے کہا تھا "روی! تم اور انورادھا برا نہ مانو تو میرے کوارٹرز میں آجانا۔ کافی کشادہ بنگلہ ہے۔ میرے لیے باہر کا ایک کمرہ کافی ہوگا۔ نوکر چاکر بھی رہیں گے" وہ سگریٹ کے دھوئیں سے کھیلتا ہوا جانے کہاں گم ہوگیا تھا۔ روی چونکا۔

"مگر اشوک ــــ!"

"اگر مگر کچھ نہیں ــــ اتنے بڑے بنگلے میں اکیلا رہوں گا کیا؟ شیلا تو آنے سے رہی۔ تم لوگ آجاؤ تو رونق رہے گی۔ اور روی! یہ کچھ اچھا بھی نہ لگے گا کہ میری موجودگی میں تم دونوں وہاں تکلیف اُٹھاؤ" اشوک کے لہجے میں جو گہری اپنائیت تھی روی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا دل بھر آیا۔ دوست ہو تو ایسا۔ لیکن اُسے ڈر تھا کہ جانے انو کیا کہے گی ــ؟

"اور سنو روی! انورادھا سے پوچھ کر اس کی پسند کی پینٹنگ وغیرہ کروا لینا"

اور جب روی نے انو کو یہ خوشخبری دی تو وہ کچن سے نکل آئی۔ خوشی سے چہرہ دمک اٹھا تھا: "سچ مکان الاٹ ہوگیا کیا؟"

"اور نہیں تو کیا۔ چلو چل کر دیکھ آئیں۔ کہا کرتی تھیں نا کہ یہاں دم گھٹتا ہے" وہ انو کو دیکھ کر خود بھی پھولے نہ سمارہا تھا "شکر ہے بھگوان!" انو نے سکھ کی سانس لی۔

سرِ شام دونوں مکان دیکھنے گئے۔ کمپونڈ میں قدم رکھتے ہوئے وہ پرشوق نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی جہاں جا بجا پھولوں کے تختے تھے۔ اُس کے دل میں پھلجڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ اس نے ایک ایک کمرہ گھوم کر دیکھا۔" بہت شاندار ہے۔ مگر" وہ کچھ کہتے کہتے روی کی جانب دیکھ کر رک گئی۔ وہ اُسے دکھ دینا نہیں چاہتی تھی" مگر کیا۔ کہو۔ کہو" وہ پاس آگیا" یہی کہ یہاں سجانے کیلے لیے کافی فرنیچر چاہیئے۔" وہ اداس ہوگئی۔

"وہ بھی آجائے گا۔ فکر نہ کرو۔ بھگوان جب دینے پر آتا ہے تو دل کھول کر دیتا ہے انو ڈیر۔!" روی نے محبت پاش نظروں سے اس کی جانب تاکا۔ اور وہ اپنے دیوتا کو عقیدت بھری نظروں سے دل ہی دل میں پھول چڑھانے لگی۔ جس کے ساتھ وہ زندگی کے پانچ بہترین سال بڑی سکھ شانتی سے گزار چکی تھی۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ چھلک آئیں، باہر شام کا سُرمئی آنچل فضاؤں پر مسلط ہو رہا تھا۔! اور پھولوں کی خوشبو چکراتی پھر رہی تھی۔ روی اور انو اپنے اپنے خیالات کی قوسِ قزح میں رنگے ہوئے تھے کہ بے بی نے انھیں چونکا دیا" ممی! مجھے پھول تا ہیئے۔ لال پھول۔"

وہ فروری کی ایک حسین شام تھی۔ ہلکی ہلکی دھوپ جا بجا پیڑوں سے چھن چھن کر گر رہی تھی۔ فضاؤں میں خنکی اور گرمی کا حسین سا امتزاج تھا! ذہن و دل میں عجیب سی مسرت ہلکورے لے رہی تھی۔ آج روی نے پکچر کا پروگرام طے کر رکھا تھا۔! انو گنگناتی ہوئی تیار ہو رہی تھی۔ بس اب آتے ہی ہونگے۔! اور وہ یہ دیکھ کر گم صُم کھڑی رہ گئی کہ اُسے لینے اشوک جیپ لے آیا ہے!" ہلو۔ کیا تم تیار ہو۔؟"

وہ تعجب سے اُسے دیکھنے لگی" ہاں مگر۔ روی کہاں ہے"

"وہ پکچر ہاؤز پہنچ جائے گا۔ چلو ہم چلیں۔۔ بے بی کدھر ہے" وہ بے بی کو آواز دیتا ہوا بیڈروم کے دروازے تک چلا آیا تھا۔ انو رادھا چپ چاپ کھڑی اُسے عجیب نظروں سے تک رہی تھی۔ وہ ٹھٹک کر پلٹ آیا" کیا تمہیں۔ میرے ساتھ چلنا پسند نہیں ہے" دل کی عمیق پہنائیوں میں ایک طوفان سا اٹھا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ وہ اشوک سے نظریں چار نہ کر سکی۔ پلکیں جھکالیں۔

"اگر تمہیں مجھ پر اتنا بھی اعتماد نہیں تو کہہ دو۔ میں چلا جاؤں گا" اشوک کی آواز میں تڑپ

تھی۔ انورادھا کا دل ہولے ہولے کانپتا رہا۔ وہ کشمکش میں ڈولتی رہی۔ اشوک کو واپس کر دے یا اُس کے ساتھ چلی جائے؟۔ روی کیا کہے گا؟۔ خود اشوک! کیا اُسے اشوک پر اعتماد نہیں رہا؟ کہیں دور جیسے کانچ کی مورتی چھن سے گری اور ریزہ ریزہ ہوگئی۔ وہ بیکل ہو اُٹھی اور موم کی طرح پگھل گئی۔ قطرہ قطرہ بہہ نکلی۔

اشوک اُسے تکتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کیا کچھ نہ تھا؟ انورادھا کچھ کہے بنا باہر نکل کر چپ چاپ جیپ میں بیٹھ گئی۔ اُس نے درمیان میں بچی کو بٹھا دیا تھا۔ ! راستہ بھر اشوک سگریٹ پھونکتا رہا۔ دونوں چپ تھے جیسے دو پتھر کی مورتیاں ۔! اشوک کے ذہن میں جانے کیا تھا۔ جانے کونسی بھولی بسری یادیں جادو جگا رہی تھیں۔ انورادھا کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا وجود بکھرنے لگا ہے۔ تنکوں کی طرح ——— ...!

اشوک نے پہلے سے سیٹیں ریزرو کروالی تھیں۔ روی چند لمحوں کی تاخیر سے آپہنچا انورادھا چپ چاپ سی کھوئی کھوئی سی رہی۔ فلم کے دوران بھی وہ کچھ نہ بولی۔ وہ اشوک سے آنکھیں ملانے سے کترا رہی تھی اور روی سے بھی سہمی جا رہی تھی!!

واپسی پر "ڈی لکس" میں اشوک نے شاندار دعوت دی۔ دونوں دوست خوش دلی سے ہنستے بولتے رہے۔ مگر خود وہ اپنے بکھرتے وجود کو سمیٹنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے پھیکی ہنسی ہنستی رہی۔ بے بی اشوک کے پاس ہی تھی۔ وہ اس کے شانے پر سوگئی تھی۔

انورادھا نے کہا "لائیے۔ مجھے دیدیجئے" اُسے اپنی آواز کی اجنبیت پر ذرا بھی تعجب نہ ہوا "اسے کوئی تکلیف ہے میرے پاس؟"۔ اشوک نے چبھتا ہوا سوال کر دیا۔ جیسے اس کی رگوں میں خون کی بجائے زہر دوڑا دیا ہو۔ وہ تھکی تھکی سی اپنی کرسی میں دھنس گئی۔ اور اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی روی اور اشوک کے ساتھ گفتگو میں حصہ لینے لگی۔ اشوک کے ہونٹوں پر لازوال تبسم رقص کرنے لگا۔

رات گئے انھیں رخصت کرتے ہوئے اشوک کہہ رہا تھا "تھینکس اے لاٹ فار دی سوئٹ کمپنی ۔!" وہ جواب دیے بغیر ڈگمگاتے قدموں سے اندر چلی گئی۔ اس کے کانوں میں اشوک کی آوازیں ٹکراتی رہیں۔ سگریٹ کی مدہوش کن مہک اور چبھتی ہوئی درد بھری آنکھیں

جیسے اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھیں۔!! وہ تکیے میں سر دیے نیند کا بہانہ کر رہی تھی کہ روی نے سرگوشی کی۔ "سو گئیں۔؟" وہ کسمسائی "اوں" دراصل اُسے روی سے بولتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ شام کا رنگین تصوّر آنکھوں میں سما گیا ہے" وہ کچھ نہ بولی۔ روی پھر بولا "بھئی چاہے کچھ بھی کہو۔ اشوک ہے بڑا ایجسٹنگ آدمی! دیکھا آج کی دعوت پر روپیہ اُس نے کس طرح پانی کی طرح بہا دیا!؟"

وہ بپھر اُٹھی "تو گویا یہ اشوک کی دی ہوئی دعوت تھی؟ تم نے مجھ سے چھپایا کیوں تھا؟ اس طرح ... اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے تمہیں ذرا بھی برا نہ لگا۔؟!"

"ارے! تم اشوک سے جلتی کیوں ہو؟ کیا بگاڑا ہے اُس نے تمہارا۔؟ وہ میرا دوست بعد میں ہے۔ پہلے تمہارا ہی بہنوئی ہے۔ ... وہ ہم پر کتنا مہربان ہے۔ کتنا خیال رکھتا ہے ہمارا — اور تم —" مانو کسی نے اسکی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی۔

"روی!" وہ چیخ پڑی۔ روی نے اس کا سرد ہاتھ تھام لیا "کیا بات ہے انو۔؟" وہ گھبرا گیا۔ "کیا تم اس قدر نفرت کرتی ہو اُس سے کہ اس کی خوبیاں تم سے برداشت نہیں ہو پاتیں۔؟"

"نہیں۔! کچھ نہیں روی" وہ ایک دم نرم پڑ گئی۔ اپنی بہکی ہوئی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے شرمندگی سے بولی "میں تو یہ سوچتی ہوں کہ وہ۔ وہ تمہارا افسر ہے! کہیں۔ وہ ہم پر احسان تو نہیں کر رہا ہے۔"

"انو رادھا —؟!۔ یہ تم بول رہی ہو — تم؟!" اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ حیران اور زخمی آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا۔ گھورتا ہی رہا —

اور انو بے بی کو بانہوں میں بھر کر سسک پڑی!!

پھر کئی دنوں تک اُن کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اشوک دورے پر چلا گیا تھا! روی بھی مصروف رہتا۔ اور جیسے انو رادھا اپنی پرانی پرسکون دنیا میں پلٹ آئی تھی۔ وہی طمانیت وہی شانتی تھی!! روی طے کر چکا تھا کہ وہ اگلے مہینے نئے مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔ وہ بڑی لگن سے اس دن کا انتظار کر رہی تھی۔ بے بی دن میں کئی بار انتل کو ضرور یاد کرتی اور انو سنی ان سنی

کا ڈھونگ رچاتی رہی۔

وہ مارچ کی ایک ڈھلتی سنہری شام تھی! بہاروں نے دھوم مچا رکھی تھی۔ رنگین تتلیوں کے پھول ہواؤں میں بکھر رہے تھے۔ خوشبوئیں۔ خنک جھونکے… پرندوں کی میٹھی تانیں۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ ایسے میں انو بھرپور سکون کے ساتھ تنہا بیٹھی ٹتنگ کر رہی تھی۔ روی کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ تب ہی۔…… کسی کے قدموں کی آہٹ نے اُسے چونکا دیا۔ اشوک سیاہ سوٹ میں ملبوس دروازے پر کھڑا تھا۔ اور جھک کر سگریٹ سلگا رہا تھا!! اس کا دراز قامت اور وجیہہ ہیولا یوں لگ رہا تھا جیسے دروازے کی فریم میں کسی نے بڑی سی جیتی جاگتی پینٹنگ آویزاں کر دی ہو" تم!" انو کے لبوں سے پھسل گیا" ہاں! دل گھبرا رہا تھا۔ سوچا کہ تم لوگوں سے مل آؤں… سویرے ہی دورے سے واپس آیا ہوں" وہ ایک لمحہ رکا پھر بولا" اجازت ہو تو اندر آجاؤں؟!" نگاہیں ملیں۔ تم کیوں چلے آئے اس وقت … تم کیوں چلے آئے… انو کے دل میں جیسے پنکھے چلنے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی" آجاؤ۔!" زبان سے صرف ایک لفظ نکل سکا۔

"روی کہاں ہے اور بے بی!؟" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"وہ شہر گئے ہیں۔ رات تک شاید لوٹ آئیں گے" تبھی بے بی اپنے کھلونے سنبھالے وہاں آگئی" انتل!" اور دوڑ کر اس کی گردن سے جھول گئی۔

"ہلو۔! تم نے کبھی یاد کیا تھا ہمیں! بے وفا کہیں کی –" وہ بے بی سے کہہ رہا تھا انو کے ہاتھ لرزنے لگے" بے وفا کہیں کی" سلائی پر سے پھندہ بار بار پھسل گیا۔ سگریٹ کی مدہم مدہم سی خوشبو کمرے میں پھیل رہی تھی! ایک دو بار اس کی نگاہیں انو کی سہمی سہمی آنکھوں سے ملیں۔ پھر جھک گئیں۔

"اچھا! تو تم لوگ کب شفٹ کر رہے ہو۔؟!"

"جب روی چاہے" وہ مختصر سا جواب دے چکی تھی۔ اور جھک کر اُون کا گولہ اُٹھانے کی کوشش میں دونوں کے ہاتھ مس ہو گئے۔ ایک لہر سی دونوں کے اندر دوڑ گئی۔ انو نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اشوک کے چہرے پر کئی رنگ آ جا رہے تھے۔ وہ پھر بولا" تو گویا

ہر کام روی کی پسند پر ہوتا ہے۔" تمہاری اپنی پسند کوئی نہیں ؟" "کبھی میری۔ کبھی اُن کی ۔۔ وہ کبھی میری بات نہیں ٹالتے، میں کبھی اُن کا دل نہیں توڑتی ۔۔۔" انورادھا نے سادگی سے جواب دیا۔

"مجھے تو روی کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے!" وہ حسرت ناک لہجے میں بولا۔ اُس نے سوالیہ نگاہیں اٹھا دیں۔ پلکیں کانپتی رہیں۔ اشوک دھیرے سے مسکرانے لگا۔ مسکراہٹ جس کے کئی پہلو تھے، ناکام حسرتیں ۔ گھایل آرزوئیں اور طنز۔" روی خوش نصیب ہے۔ جو تم اس کی ساتھی ہوئے، تم نے تو زندگی کو سورگ بنا دیا ہے۔"

"نہیں! یہ میری اچھی قسمت ہے جو روی کے دامن سے میرا دامن بندھا۔ وہ ایک نیک مزاج ۔ سیدھے انسان ہیں۔ میں اپنا سارا جیون بھی اُن کے لیے تیاگ دوں تو کم ہے" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "ہاں! قسمت والوں کو ہی اچھے ساتھی ملتے ہیں۔ سنجوگ کی بات ہے!" وہ ایک گہری آہ بھر کر بولا۔ اور بجھتے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگانے لگا۔

"تمہیں کس بات کی کمی ہے؟" انو نے اون کا پھندہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"یہ پوچھو کس بات کی کمی نہیں ہے، میں نے کیا کھویا کیا پایا۔ تم نے تو جیون بنا لیا مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ تمہاری پیاس بجھ گئی۔ تمہیں ساحل مل گیا۔ میں سدا سے سلگتا رہا ہوں۔ بھٹکتا رہا ہوں۔ میں نے کچھ بھی نہیں پایا۔!! تم جانتی ہو شیلا کس قدر مغرور اور خود سر لڑکی ہے۔ قسمت نے جب مجھے شیلا کے جیون سے باندھ دیا تو میں نے سوچا۔ چلو یونہی سہی۔ وہ مجھے اپنے پیار کے ساگر میں ڈبو دے گی۔ تو میں بھی اپنے گھایل من کو سمبھالوں گا۔ مگر ۔۔ میں پیاسا ہی رہا۔ میرے زخم رستے ہی رہے۔! جو سب کچھ لے کر بھی کچھ نہیں دیتے۔ شیلا ان ہی لوگوں میں سے ہے۔"

"اوہ! ڈیڈی پر الزام نہ لگاؤ۔ میں سن نہ سکوں گی!" وہ تڑپ اٹھی۔ پلکیں جھکی ہی رہیں لیکن اُس نے محسوس کیا کہ اشوک برابر اُسی کو دیکھے جا رہا ہے۔ اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

"آج تو تمہیں سب کچھ سننا پڑے گا، رادھا!" اشوک گہرے کرب سے بول اٹھا اور

انو سارے بدن سے لرز گئی۔ اور بے اختیار نگاہیں اُٹھ گئیں۔ اشوک کے لبوں پر طنزیہ مسکان تھی۔" تم نے تو پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ اشوک کس حال میں ہے ؟ جی رہا ہے کہ مرگیا۔ تمہاری دیدی نے بھی میری پروا نہیں کی۔ میرا کوئی خیال نہیں کیا۔ میں برسوں اپنی پوسٹنگ پر اکیلا بھٹکتا رہا ہوں۔ وہ آرام سے میکے میں رہتی ہے۔ کہاں خانہ بدوشوں کی طرح میرے ساتھ بھٹکتی پھرے گی " وہ ہنسا۔ کھوکھلی ہنسی ۔

ایک ایک کر کے اشوک کے اطراف تنے ہوئے پردے گرنے لگے۔ بکھرنے لگے۔ اس کے اندر کا اشوک اپنی ساری محرومیوں کے ساتھ انورادھا کے سامنے کھڑا تھا۔! انو کے دل میں ببول کے کانٹے سے پیوست ہو گئے۔ لیکن اُس نے ضبط کا دامن نہ چھوڑا۔

"تم نے اُسے اتنی آزادی کیوں دے رکھی ہے !؟ اُسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے آتے؟"

انو کے ہاتھوں میں سرد ٹھنڈی سلائیاں جیسے منجمد ہو گئی تھیں۔ ... سارے پھندے پھسل چکے تھے ... ایک بھی سرا اب اُس کے بس میں نہیں تھا ... جیون کے تانے بانے بنتے بنتے وہ الجھ گئی تھی ... اور اب کافی دیر ہو چکی تھی ... وہ الجھے تار کیسے سلجھاتی ؟! اشوک کہہ رہا تھا۔

"صرف اس لیے اسے ساتھ لاؤں کہ رات دن مجھ سے جھگڑتی رہے۔ ؟! اُسے کلب کی رنگینیاں چاہئیں۔ وہ گھر کی شمع بن کر نہیں رہ سکتی۔ میں نے زندگی کے سارے سکھ اس کے چرنوں میں ڈال دیے ہیں۔ لیکن وہ خوش نہیں رہ سکتی۔ اور میں گھر کی سکھ شانتی کو ترس ترس گیا ہوں رادھا! بچوں کے پیار کو ترس گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے دن بھر کی تھکن کے بعد گھر پہنچوں تو کوئی میرا سواگت کرے۔ بچے میرے پیروں سے لپٹ جائیں اور میں اپنی ساری تھکن ساری پریشانیاں بھول جاؤں۔ ڈوب جاؤں۔ تمہاری دیدی کبھی نہیں پوچھتی کہ میری بھی کچھ آشائیں ہوں گی ... کچھ سپنے ہوں گے۔ تمہارا سکھی جیون دیکھ کر میں کتنا خوش ہوں جیسے سورگ میں آگیا ہوں "

"اشوک !" ۔ انو کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ نکلی ۔

"یہ سگریٹ میرا ساتھی ہے۔ کسی بھی وقت مجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ میں بھی جلتا ہوں یہ بھی جلتا ہے " وہ آج اپنے زخم جھیل کر نئی لذت سی محسوس کر رہا تھا۔

"اشوک !"۔ وہ پھر تڑپ اُٹھی۔ چاہتی تھی کہ بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دے

"اسی لیے تو میں چاہتا ہوں تم لوگ جلد اُس بنگلے میں آجاؤ۔ اتنے بڑے گھر میں مجھ سے تنہا رہا نہ جائے گا۔ تم سب آجاؤ تو۔۔۔ تو رونق آجائے گی۔" وہ اپنی دھن میں کہتا گیا۔ سگریٹ کا کش لگا کر جونہی انورادھا پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ پھٹی پھٹی حیران آنکھوں سے اُسے تک رہی تھی! اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ "کچھ تو کہو انورادھا۔ کچھ تو کہو۔۔۔۔ تم نے دیکھا تمہارے اشوک کے من میں کتنے گھاؤ ہیں۔ وہ کتنا سُکھی ہے۔۔۔ کتنا سُکھی۔۔۔۔۔؟!

"اشوک ؟!" وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر پھوٹ پڑی "تم یہاں کیوں چلے آئے اشوک! میرا سکھ چین سب لٹ گیا ہے۔ میری نیندیں اُجڑ گئی ہیں۔۔۔ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگ رہا ہے۔ تم سے ڈر لگ رہا ہے۔ اور۔ اور روی سے بھی"

وہ سسکتی رہی۔ کمرے میں اندھیرا پھیل چکا تھا۔ فضا بوجھل تھی۔ اور دونوں اپنے اپنے غموں کی آگ میں جھلس رہے تھے۔

"رادھا! تم۔ تم مجھے غلط نہ سمجھو۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

"کہیں جذبات کی تیز آندھی میری تپسیا کا دیپ نہ بجھا دے۔! میں نے کتنے جتن سے اس دیے کو جلائے رکھا ہے۔ جس میں میرے پوتر پریم اور وفا کا لہو جل رہا ہے۔ اب میں صرف روی کی ہوں۔ بے بی کی ہوں۔ اور کسی کی نہیں اور کسی کی بھی نہیں۔!"

"انورادھا! میں اتنا نیچ ہرگز نہیں ہوں کہ تمہارے بیاہتا جیون میں آگ لگا دوں۔ تمہاری حسرتوں کے پھولوں پر کبھی گناہ کی دھوپ نہیں پڑ سکتی انو۔ میں تو خود ہی سلگ رہا ہوں۔ کاش! کاش کوئی اس آگ کو بجھا سکتا!"

"تم۔ تم یہاں سے چلے جاؤ اشوک! چلے جاؤ!۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میرے سکھی جیون میں کوئی طوفان آجائے؟ اور ہم سب تنکوں کی طرح بہہ جائیں؟ ——————

—————— میں ان پانچ برسوں میں تمہیں بھلا چکی ہوں اور اپنے آپ کو روی کے چرنوں میں ارپن کر چکی ہوں۔ اب تم کسی اور آزمائش میں نہ ڈالو مجھے!" وہ رک رک کر بولی۔ اس نے ایکبار بھی اشوک سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس کے گالوں پر سیتا کی سی پاکیزگی کا اجالا بکھرا ہوا تھا

جسے شام کے مدہم اندھیرے میں بھی اشوک نے محسوس کیا۔ اُس کا دل جیسے کٹ کر اندر ہی اندر گرنے لگا تھا۔! اُس نے ہاتھ بڑھا کر بتّی جلا دی۔ کمرہ روشن ہو گیا تھا لیکن دلوں کے اندھیرے ابھی تک باقی تھے۔ اشوک نہیں چاہتا تھا کہ انورادھا اس پر کوئی شک کرے۔ وہ اپنی آواز میں پورا خلوص سمو کر بولا "تمھیں جتنا اعتماد اپنے آپ پر ہے اتنا ہی اعتماد تم اشوک پر بھی کر سکتی ہو۔ انورادھا! میں تو بس اتنا چاہونگا کہ تمھیں دیکھتا رہوں، تمہاری آواز میرے پیاسے جیون میں رس گھولتی رہے۔ میرے گھاؤ بھرتی رہے کہ میں اپنے دکھ بھول کر جینا سیکھ لوں۔ میرے لیے یہی کافی ہوگا۔ میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگوں گا انو! کچھ نہیں مانگوں گا۔"

اس کی آواز شدّتِ جذبات سے بھاری ہو گئی۔ وہ خود پر قابو پانے کے لیے جیسے اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی ہستی ریزہ ریزہ بن کر ہواؤں میں اُڑی جا رہی ہو — بوند بوند بہی جا رہی ہو۔!!

"نہیں اشوک نہیں! میں پگھل جاؤں گی۔ بہہ جاؤں گی۔ ان کانپتی دیواروں کو گرنے نہ دو اشوک! جو میں نے اپنے اطراف بُلند کر لی ہیں۔ ان دروازوں پر، کھڑکیوں پر دستک نہ دو جو میں نے برسوں پہلے بند کر لی ہیں۔ ورنہ — ورنہ"

"میں تم سے صرف اتنی ہی بھیک چاہتا ہوں انورادھا کہ مجھے، میری پیاسی آتما کو تمہاری موجودگی کے احساس سے خوش ہو لینے دو۔ میرے لیے یہی احساس ایک دولت سے کم نہ ہوگا کہ تم میرے اُس پاس کہیں موجود ہو —— تمھارے قدموں کی آہٹ تمہاری سانسوں کی سرگم ...... تمہاری آواز کی وینا میرے لیے جیون کا پیغام ثابت ہوگی۔ بھگوان کرے تم اور روی یونہی سکھی رہو۔ بے بی یونہی تمہاری خوشیوں کا مرکز بنی رہے۔ میں۔ میں کبھی تم لوگوں کے بیچ دیوار نہیں بننا چاہوں گا انورادھا! کبھی دیوار نہیں بنوں گا۔" اشوک کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹ چھوٹ گیا زخموں کے سارے ٹانکے ٹوٹ گئے۔ اسکی بڑی بڑی گمبھیر آنکھوں سے موتیوں کے دانے چھلک پڑے۔!!

انو آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھا کر اپنی جل تھل آنکھوں سے اُسی کو تک رہی تھی! اشوک کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ اشوک سے لپٹ جائے۔ اس کے سارے

آنسو اپنے آنچل میں سمیٹ لے۔ لیکن وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی "میں۔ میں مجبور ہوں اشوک!" اس کی آنکھوں میں ایک ایسی بے بسی اور التجا تھی کہ اشوک سوکھے زرد پتے کی طرح کانپ اٹھا۔ زبان سے کچھ بھی نہ کہا، چپ چاپ اُٹھا اور ایک حسرت بھری نگاہ اس پر ڈالی جو کہہ رہی تھی۔ "میرے کشکول میں خلوص کی ایک بھی بوند نہیں ڈالو گی تم؟"۔ اور سر جھکائے ہوئے باہر نکل گیا۔

"میں کیا کروں ۔۔۔ میں کیا کروں بھگوان" ۔۔۔ انو نے دیوار سے سر ٹیک دیا۔ سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا فرش پر پڑا سلگ رہا تھا! باہر رات کا اندھیرا جیسے اشوک کو نگل چکا تھا! اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا۔ سارا لہو کسی نے نچوڑ دیا ہو۔

آج اس کے سارے زخم چیخ اٹھے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ ڈھانپ کر روتی رہی۔ روتی ہی رہی۔ اس کے اطراف کھڑی ہوئی دیواریں اینٹ اینٹ کر کے گرتی جا رہی تھیں۔ اس نے چاہا کہ ان دیواروں کو تھام لے۔ مگر ...... وہ ہار گئی۔ ساری بند کھڑکیاں اور دروازے ایک کر کے کھلتے جا رہے تھے۔ اور وہ تندی طوفان میں بہہ نکلی۔!!

اشوک کی سندر شخصیت اور گمبھیرتا نے انورادھا کا دل موہ لیا تھا۔ اور اشوک نے انو کے روپ میں اپنا آئیڈیل پا لیا تھا۔ یونیورسٹی کی رنگین فضاؤں میں دونوں ایک دوسرے کو اپنا سمجھتے ہوئے بھی محتاط رہتے کہ زمانے کی تیز نگاہوں کو ان کے احساسات کا پتہ تک نہ چل سکا۔ دونوں کو ایک دوسرے پر گہرا اعتماد تھا۔ وہ روح و دل سے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔ امتحانات کے بعد انورادھا ہوسٹل سے گھر واپس آئی تو اچانک ہی اسکی دیدی کی منگنی ہو گئی۔ یہ رشتہ پتا جی کی پسند پر اُن کے دوست کے لڑکے سے طے ہوا تھا۔ اور انو اس وقت پتھر بن گئی جب اس نے اشوک کو دولھا کے روپ میں دیکھا! وہ سامنے سے بھاگ گئی۔ اُس نے چاہا کہ خود کو کہیں چھپا دے۔ لیکن اشوک کی نگاہیں اپنے محبوب کو پہچان چکی تھیں۔ اور تنہائی میں اُس نے ساری بات بتا دی؛ "میرے پتا جی بستر مرگ پر پڑے ہیں انورادھا۔۔۔ میں ان کا دل اس لیے نہ توڑ سکا کہ ان کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں ایک ہی آرزو ہے مجھے اپنے دوست کی لڑکی کے دامن سے باندھ دیں۔ میں احتجاج بھی نہ کر سکا۔ میں صرف یہ منگنی کر رہا ہوں شادی نہیں! شادی تم سے ہی کروں گا اور کسی سے نہیں انورادھا!" وہ فیصلہ کن لہجے میں کہہ رہا تھا تب

وہ سہم گئی۔ اور قسم دیدی کہ وہ اس کی دیدی کے ماتھے پر کلنک نہ لگائے گی اور یہ کہ اشوک کسی بھی حال میں یہ رشتہ نہ توڑے! اپنے پتا جی کی لاج رکھ لے۔!! ورنہ وہ اپنی بہن کو اپنے ماں باپ کو صورت نہیں دکھائے گی "۔ یوں اچانک ان کی راہیں بدل گئیں۔ اور شیلا کے بیاہ کے فوراً بعد اُس نے روی کے آئے ہوئے پیغام کو قبول کر لیا تھا صرف اس لیے کہ اشوک اور شیلا کی دنیا پر اس کا سایہ تک نہ پڑ سکے۔

اور آج وقت کی دھارا اُسے کہاں لے آئی ہے؟ یہ موڑ کہاں سے آگیا کہ دو بچھڑے ساتھی اچانک پھر سامنے آگئے ہیں ۔۔۔ ؟!

یہ دوراہا کیسا ہے؟ وہ کیا کرے۔ وہ کیا کرے؟!۔۔۔ روی کا گریڈ بڑھنے والا ہے جس کے لیے وہ برسوں سے کوشاں رہا ہے۔ اور وہ سب کچھ اس کی زندگی میں آنے کو ہے جس کی خود اُسے آشا ہے۔ اونچا عہدہ ... عزت دولت ... ایک آرام دہ ۔۔ زندگی ۔۔!
روی کب سے اپنے حالات سے لڑتا آیا ہے۔ اور اب اشوک نے روی کے لیے کیا کچھ نہ کیا؟ لیکن ۔۔ یہ سب احسانات کیوں؟ کیا وہ اس طرح اپنی تشنہ محبت کی تسکین کا سامان کر رہا ہے؟ اشوک کے تصور نے اس کے اعتماد کی دھجیاں اڑا دیں۔ اشوک، جو اس کا پہلا پیار تھا! جس کے انتظار میں اُس نے سوتے جاگتے، جیون کے حسین سپنے بنے تھے۔ جو اس کی جوانی کے سپنوں کا شہزادہ تھا۔ وہ ایک طلسمی سحر میں ڈوبنے لگی۔ ایک کومل سا احساس اس کی رگوں میں تیرنے لگا۔ "اشوک!!" اس کے انگ انگ میں آگ سی بھڑک اٹھی ... خیالوں کے آکاش پر بھولی بسری یادوں کی چاندنی آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ وہ مسکرانے لگی۔ اشوک کے نام کے ساتھ کتنی سجل کائنات کھل اُٹھی تھی۔

میں اشوک کو سہارا دوں گی ... دیدی نے اُسے کچھ بھی نہیں دیا۔ میں اس کی بیمار آتما میں نئی زندگی ڈال دوں گی ... اشوک میرا اپنا تھا ... اتنا اپنا دنیا بھر میں کوئی اور نہ تھا! اور اب اشوک کتنا تنہا کتنا دکھی ہے۔ میں اس کے ہونٹوں پر کلیاں سجا دوں گی۔ اس کے سارے آنسو پونچھ دونگی۔ سارے زخم بھر دوں گی۔ اشوک! اشوک!! وہ ساری رات طوفانی لہروں میں ڈولتی رہی۔ ڈوبتی رہی، ابھرتی رہی۔ ساری رات دُور کنارے پر دیا جلتا رہا۔

دن گزرتے رہے۔ وقت لمحہ بن کر اُترتا رہا۔ زندگی اُسی ڈگر پر چلتی رہی روی خوش تھا کہ آج کل میں نئے مکان میں تبدیل ہو جائیں گے۔ ساری تیاریاں مکمل تھیں۔ بنگلے کی نئی طرز پر سجاوٹ ہو گئی تھی۔ در پردہ اشوک ساری ذمہ داریاں قبول کر چکا تھا ــــ

انو رادھا کے جذبات میں ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ وہ ایک فیصلے پر پہنچ کر پر سکون ختنیل جھیل کی طرح ہو گئی تھی۔ ایک حسین سی فضا ہر وقت اس کے ذہن و دل پر چھائی رہتی ــــ

اُس رات وہ آہستہ سے بولی "روی! میری ایک بات مانو گے؟"

"بھئی! ایک کیا دس کہو۔ میرے خیال میں تو اب ایسی کوئی کمی نہیں رہ گئی تمہارے نئے مکان میں، صرف تمہارا انتظار ہے وہاں!"

"نہیں۔ یہ بات نہیں! تم ــ تم اپنا ٹرانسفر کرا لو"

"انو؟! یہ کیا بات ہوئی آخر ــ؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئیں ــ ؟!"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے روی! کچھ نہیں چاہیئے۔ چلو ہم کہیں دور چلے جائیں جہاں کوئی اور نہ ہو" وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی۔ روی اُسے یوں گھورنے لگا جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ "تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟ کیا کمی ہے اب جبکہ میرا گریڈ بڑھنے والا ہے۔ آج کل میں تو وہ سب کچھ ہو جائے گا۔ جو ہم برسوں سے حاصل نہ کر سکے تھے"

"روی! میں تو بس اتنا سوچتی ہوں کہ اس طرح کسی کا احسان لینا تمہاری شان کے خلاف ہے۔ کیا تم یہ گوارہ کر لو گے کہ تم تمام عمر اشوک کے احسان مند بنے رہو؟ اُس سے دبے رہو! وہ اپنا رشتہ دار سہی۔ لیکن ہے تو تمہارا باس ہی۔ مجھ سے سہا نہ جائے گا روی کہ تم، تم اشوک کے احسانات کے بوجھ میں دبے رہو ــ" وہ اتنے اعتماد اور سنجیدگی سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی کہ روی کے اپنے دل کی بنیادیں کانپ گئیں۔ وہ چپ چاپ گم صم سا بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ ایک گہری خاموشی چھائی رہی ــ پھر وہ بولا "تم ٹھیک کہتی ہو انو! . . . میں نے تو یہ سب کچھ سوچا ہی نہیں تھا" روی کی آواز میں گہری تھکن کانپ رہی تھی۔ اور چہرہ نڈھال تھا۔

"روی!" وہ بھرپور آواز میں بولی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کے ہونٹ

کانپنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اور روی اُسے لپٹا کر حسرت بھری مسکراہٹ اپنے لبوں پر بکھیرے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ انو اس کی بانہوں میں سمٹی اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہی تھی، جیسے گرتی دیواریں سنبھل گئی ہوں۔ اور وہ ذہن و دل کی ساری کھڑکیاں سارے در پھر سے بند کرنے میں کامیاب ہوگئی ہو۔!!

وہ صبح دونوں کے لیے بے حد حیران کن ثابت ہوئی۔ جب روی کو اپنے پرموشن کی اور اشوک کے تبادلے کی غیر متوقع خبر ملی۔ روی کو اشوک کی جگہ لینے کے آرڈرس تھے۔ وہ سکتہ زدہ سا رہ گیا۔

اور انو رادھا کو ایسا لگا کہ ایک ایک کر کے ساری دیواریں گر گئی ہیں: ریت کی دیواریں ——— اور سارے پٹ کھُل گئے ہیں۔

اشوک نے جاتے جاتے انو اور روی کی زندگی میں سب کچھ ڈال دیا تھا اور وہ خود اُسے کیا دے سکی تھی؟ کچھ بھی نہیں۔ خلوص کی ایک بوند بھی تو نہیں!!!

اور اس کی آنکھوں سے گنگا جمنا سی بہہ نکلی۔ کہیں دُور دل کی پہنائیوں میں ایک آہ سی ابھری ——— "اشوک!!" ———

OO

کچّا دھاگہ

آج سوموار ہے......

ابھی نو بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں، کل کا دن مَیں نے بے کلی کے نوک دار کانٹوں پر گزارا تھا۔ ہر پہلو میں یادوں کے سینکڑوں کانٹے چُبھ جاتے اور میں تڑپ اُٹھتا۔ وہ سیکنڈ کراس نمبر ۱۲ کے گیٹ پر چنبیلی کی بیل کے نیچے میری راہ تکتی ہوگی، یوں جیسے کوئی بُت ایستادہ ہو۔

میں ہزار کوشش کرتا ہوں کہ کوئی دن اس سے پہلے کہ وہ گیٹ پر آئے خود چپکے سے پہنچ جاؤں — لیکن ان تمام مہینوں میں ایک بار بھی یہ موقع نہیں مل سکا ہے۔ وہ کسی بت کی طرح وہاں پہلے سے موجود ملتی ہے۔ دور ہی سے اُسے دیکھ کر میرے دل کی سطح پر انجان خوشی کی لہریں ہلکورے لینے لگتی ہیں۔ میری آنکھوں میں دھنک سی چھا جاتی ہے اور میں جیسے ہَوا کے دوش پر اُڑتا ہوا نمبر ۱۲ تک جا پہنچتا ہوں۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں، گلابی ہونٹوں پر چنبیلی کھل اُٹھتی ہے۔

اور میں مشینی انداز میں ڈاک اس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ بولتی آنکھوں سے ایک پل مجھے دیکھتی ہے۔ میں جھجک کر مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک پل کو ہماری آنکھیں مل کر جدا ہو جاتی ہیں اور میں سائیکل سنبھال لیتا ہوں..... میرے قدم بوجھل ہو جاتے ہیں۔ میں کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح دھیرے دھیرے پیڈل کرنے لگتا ہوں — ایسا لگتا ہے میری سائیکل آگے جانے کی بجائے

پیچھے ہی پیچھے جانا چاہتی ہو۔ میرے سر پر چنبیلی کی ٹھنڈک کے بدلے تیز سورج چمکنے لگتا ہے۔

یہ میرا معمول بن گیا ہے۔ جب سے برنداون ایکسٹینشن میں میری ڈیوٹی لگی ہے۔ اس نمبر ۱۲ والی مس رعنا کو دیکھا ہے۔ میں شام ہی سے صبح کی راہ دیکھتا ہوں اور صبح سویرے نئی اُمنگ لیے پوسٹ آفس جا پہنچتا ہوں۔ جب تک پوسٹ سارٹ ہو کر مجھے نہ ملے بے قرار رہتا ہوں۔ بار بار میری نگاہیں کلائی پر بندھی گھڑی پر جاتی ہیں اور میں اپنا تھیلا لیے کسی آوارہ بادل کی طرح تیر جاتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں جتنی جلد ہو سکے وہاں جا پہنچوں۔ جلد جلد دوسروں کی ڈاک پھینکتا ہوں۔ وہاں تک پہنچتے ہوئے تھکن کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہو پاتا۔ مانو مس رعنا کا دیدار ایک عبادت بن گیا ہو!

کبھی کبھی وہ مجھ سے ہنس بول بھی لیتی ہے۔

"کیا بات ہے پوسٹ مین! آج تم نے دیر لگا دی۔؟"

"جی! جی وہ کچھ منی آرڈرس دینے تھے۔ ذرا دیر ہو گئی۔" میں پہلے سے الگ کر کے رکھی ہوئی اُس کی ڈاک اُٹھا لیتا ہوں۔

"میں نے تمہارے انتظار میں ابھی کافی بھی نہیں پی ہے۔" اُس کے ہونٹوں پر کنول کھلنے لگتے ہیں۔ میں حیران نظروں سے دیکھنے لگتا ہوں۔ برآمدے میں تھرماس رکھا ہوا ہے۔

"چلو تم بھی ایک پیالہ کافی پی لو۔" وہ جیسے حکم دیتی ہے۔

"نہیں، تھینک یو"

"ارے تکلّف کیوں کرتے ہو۔ آؤ ایک منٹ لگے گا، پھر چلے جانا۔" وہ بنڈل اُٹھائے مڑ جاتی ہے اور میرے قدم کسی تصوّراتی دنیا میں بادلوں پر پڑنے لگتے ہیں۔ گرم گرم بھاپ اُڑاتی ہوئی کافی میرے سامنے آجاتی ہے اور میں دبا دبا سا غیر اختیاری طور پر ہونٹوں سے پیالہ لگا لیتا ہوں۔

ہم دونوں کے بیچ تکلّف کی خلیج پٹ گئی۔ اب میں آتا ہوں تو دو چار منٹ رُک کر اُس سے باتیں بھی کر لیتا ہوں۔ کبھی کبھی کافی بھی پی لیتا ہوں۔ وہ میز پر ڈاک اُلٹتی پلٹتی رہتی ہے۔" جی چاہتا ہے ساری ڈاک لے لوں۔"

"لے لیجیے !"

"دوسروں کو کیا جواب دو گے ؟" جھکی پلکیں میری طرف اٹھ جاتی ہیں۔
اور میں مسکرا دیتا ہوں۔ مانو کہہ رہا ہوں " تمھاری خوشی کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

میں پوسٹ مین ہوں۔ میرا کام ہی خط بانٹنا ہے۔ اگر کوئی اپنی ڈاک کا انتظار کرتا ہے تو میرے خوش ہونے کی وجہ کیا ہے بھلا ! ؟ لیکن میں جان بوجھ کر اپنے آپ کو فریب دیتا ہوں۔ مس رعنا ایک نامور شاعرہ ہے۔ اس کے نام ہر روز ان گنت خط آتے ہیں، رسالے اور اخبار آتے ہیں اور وہ بھی اکثر دو چار لفافے میرے ہاتھ میں تھما دیتی ہے " ذرا یہ پوسٹ کر دینا۔ یہ لفافہ رجسٹری سے جائے گا اور اس کا وزن کرا لینا۔" وہ بے تکلف کہتی جاتی اور کسی کا بھرپور اعتماد پا کر میرا سر فخر سے تن جاتا ہے۔

" یہ رسید، یہ بقیہ "... میں دوسرے دن اسے کہتا ہوں۔
" کوئی خط نہیں ؟ " اس کی آنکھوں میں سایہ سا ڈولتا ہے۔
" نہیں ۔"
" تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔" وہ بے یقینی کے کہرے کو ہٹانا چاہتی ہے۔ اور میرا دل کہتا ہے مسٹر اشوک ! یہ سارے کا سارا تھیلا اسے تھما کر بھاگ جاؤ ! تاکہ چاند سے گھٹا چھٹ جائے۔

اتوار آتا ہے تو میرے دل پر مایوسی کے سائے لہرانے لگتے ہیں۔ سوچتا ہوں کسی لفافے پر رعنا کا پتا لکھ کر چپکے سے دے آؤں۔ ! مسکان جو پنکھڑی پنکھڑی اس کے لبوں پر کھلتی جاتی ہے، وہ مسکان دیکھ آؤں ! کیا وہ اتوار کا دن بھی چنبیلی کے نیچے میری راہ تک رہی ہو گی میری آنکھوں میں سیکنڈ کراس کی پچکی سڑک آجاتی ہے اور چنبیلی کی سفید سفید کلیاں بکھرنے لگتی ہیں اور اس کی یاد میری انگلی تھامے قدم قدم آسمان کی بسیط پہنائیوں میں پرواز کرنے لگتی ہے۔ بادلوں سے پرے میں کسی پتنگ کی طرح اوپر ہی اوپر اٹھتا جاتا ہوں۔

میں پتنگ ہوں اور وہ ڈور۔ نہیں میں ڈور ہوں اور وہ پتنگ ہے۔ جہاں چاہے لیے لیے پھرتی ہے۔ کبھی بلندیوں پر اُٹھنے لگتی ہے۔ کبھی غوطہ کھا کر نیچے دھرتی کی طرف اترنے لگتی ہے۔ جانے کب تک یہ کھیل جاری رہے گا، میں ڈرتا ہوں کبھی نہ کبھی ڈور کو کٹ جانا ہی ہے۔

یہ کیسی ڈور ہے؟

ان آنکھوں میں جھانکتی ہوئی چمک کیسی ہے؟

میرے اندر کے مرد نے اس چمک کو پہچان لیا ہے۔ کرن کے یہ پھول میرے ہی لیے کھِلتے ہیں۔ یہ ملے جلے سے جذبات کیسے ہیں؟

دیوالی کے تہوار پر میں نے گھر کی بنی کچھ مٹھائی اور پھول ایک بڑے سے لفافے میں ڈالے۔ اور اوپر بڑے بڑے خوش نما حروف میں اس کا نام اور پتا لکھ کر ڈاک کے ساتھ اسے دے آیا۔

"بھئی کل ہم نے دیوالی منائی تھی" دوسرے دن وہ ہنس کر بتا رہی تھی۔

پھر بولی "کل ایک تماشا ہوا۔" ہم لوگ شوپنگ کو جا رہے تھے۔ وہاں کوئی خاکی ڈریس والا جا رہا تھا اور میں ایک دم چلّا اُٹھی "پوسٹ مین!" وہ مسلسل ہنستی رہی اور میرے ہاتھ سے تھیلا گرتے گرتے بچا تھا۔

آج سوموار ہے۔ میں چھٹی کے آٹھ دن کانٹوں پر گزار کر آیا ہوں اور اسی لگن کے ساتھ خطوط کا پلندہ سنبھالے سیکنڈ کراس کی طرف بُول کے دوش پر اُڑا جا رہا ہوں۔ میرے پیروں میں بجلی کی سی پھرتی ہے۔ آنکھوں میں چنبیلی کی کلیاں —— جانے کب نمبر ۱۲ آ پہنچا اور جیسے کسی نے میرے دل پر گھونسہ مار دیا ہو —— وہاں کوئی نہیں ہے۔ چنبیلی اُداس ہے۔ برآمدے میں میز خالی ہے —— میرا دل بجھ سا گیا ہے۔ میں جیسے برسوں پرانے کسی کھنڈر میں آگیا ہوں۔ جانے یوں ہی کھڑے کھڑے کتنے قرن بیت گئے۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے ڈاک سنبھالی..... اور گھنٹی پر انگوٹھا رکھ دیا۔

"ٹرنن.... ٹرنن...... یہ گھنٹی آج پہلی بار یہاں گونج رہی ہے۔ میں چاہتا

ہوں وہ اچانک میرے سامنے چلی آئے۔ کسی بھولی بھٹکی روح کی طرح۔!

میرے سامنے اُس کی چھوٹی بہن آکھڑی ہوئی ہے!

"باجی کا بیاہ ہوگیا۔ وہ دولھا کے گھر چلی گئیں"

چھپاک سے پانی کا تیز ریلا میرے سر سے گزر گیا۔ میں موج در موج ڈوبتا چلا جارہا ہوں۔ اور میرے ہاتھوں سے خطوط بکھر گئے ہیں۔ جیسے تیز لہر کے بعد ویران ساحل پر گھونگھے اور سیپیاں پڑی رہ گئی ہوں!

میں کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا۔ میرے قدم من من بھر کے ہوگئے ہیں، میرے سر پر تیز دُھوپ جھلس رہی ہے۔ چنبیلی جھلس گئی ہے۔

میں یہ کیسے بھول گیا تھا کہ میرے اس کے درمیان جو ڈور بندھی تھی وہ کچّے دھاگے کی تھی۔ مگر — میرا دل ایک ہی بات دہرا رہا ہے۔ یہ بندھن تو اٹوٹ ہے۔ کیا دل اور آتما کا بندھن بھی کبھی ٹوٹتا ہے؟!!

○○
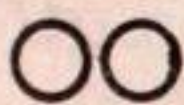
اُجڑے دیار میں

"آگئے سعدی!" شمع آپا تیزی سے صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ نیند کی متوالی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی۔

"معاف کیجیے، کافی دیر ہوگئی۔ دراصل کچھ دوستوں نے پکچر کا پروگرام....." سعدی دیر سے گھر پہنچنے پر پشیمان تھا۔ اور صفائی پیش کرنا چاہتا تھا کہ انھوں نے بات کاٹ دی۔

"میں نے یہ سب تو نہیں پوچھا۔" ان کی نگاہوں میں شکایت تھی۔ سعدی نے نظریں جھکا لیں۔

"اچھا تم کپڑے بدل لو۔ میں کھانا لگا دوں۔" وہ ڈرائنگ روم کی طرف مڑیں۔ "جی نہیں — تکلیف نہ کیجیے۔" وہ ہکلا گیا۔

"کیوں"؟

"میں کھانا کھا چکا ہوں — میں واقعی شرمندہ ہوں۔" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا کیوں کہ دو آنکھیں عجیب سے انداز میں اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں....... تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

"اور آپ نے کھا لیا؟"

"میں؟ میں بھلا اب تک بھوکی رہتی!" اُن کے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ آگئی۔ "شب بخیر۔" آپا نے سعدی سے نظریں ملا دیں۔

"شب بخیر —!" اور وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

جب سے سعدی کا تبادلہ یہاں ہوا تھا۔ شمع آپا کی سرگرمیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ یوں بھی وہ ان کا مہمان تھا۔ پھر وہ ان کا نسبتی بھائی بھی تھا! سعدی کا قیام اس گھر میں عارضی تھا۔ مگر شمع آپا اور ان کے ابا کے اصرار پر وہ مستقلاً ٹھہر گیا ـــــ اور شمع آپا کی تنہائیوں میں کسی کی رفاقت کی سحر انگیز خوشبو رچ گئی۔

سعدی پہلے پہل ان سے بہت تکلف برتتا تھا۔ پھر شمع آپا کی نگاہوں میں جلتی ہوئی خلوص کی قندیلوں نے تکلفات کے اندھیروں کو بتدریج دور کر دیا۔ ان کے بے انتہا خلوص۔ سادگی اور جاں نثاری نے سعدی کا دل موہ لیا۔ وہ ان کا پجاری بن گیا۔

فرصت کے وقت میں وہ اکثر شمع آپا سے گپ شپ کرنے کے لیے آدھمکتا وہ کسی کام میں ہیں اور یہ جھٹ حاضر!

"لائیے میں بھی ہاتھ بٹا دوں!"

آپا کے لبوں پر حیات بخش تبسم جھلک اٹھتا ـــــ "نہیں!"

"کیوں نہیں؟"

"یہ کام تم نہیں کر سکتے"۔ ان کی آواز میں ایک دبدبہ ایک رعب سا پوشیدہ ہوتا۔

"اب میں ایسا بدھو، کند ذہن بھی نہیں ہوں کہ انڈے بھی نہ پھینٹ سکوں"۔ وہ ہنسنے لگتیں اور یہ ہاتھ سے مشین چھین کر چلانے لگتا۔ سعدی کو پڈنگ بہت پسند تھی۔ اور شمع آپا کا یہ ایمان بن گیا تھا کہ جو چیز اسے پسند ہو وہ تیار کر دیں۔

کبھی کبھی شمع آپا ٹوک بیٹھتیں "یہ کیا ہر کام میں آٹپکتے ہو"۔

وہ جواب دیتا "ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا!"

"عجیب ہو تم بھی ـــــ! میرا اتنا خیال کیوں کرتے ہو" جانے وہ کیا پوچھ بیٹھیں۔

"پنچھی کے دو پر ہوتے ہیں نا! اور وہ ایک پر سے نہیں اڑ سکتا"

اور شمع آپا کی نظریں کھڑکی سے دور آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں پر جا پڑتیں... وہ کھڑے کھڑے آسمان کی وسعتوں میں دودھیا بادلوں کی چھاؤں میں پرواز کرنے لگتیں۔ اور جب چونکتیں تو ان کی پلکوں پر نمی ہوتی۔ نہ جانے کیوں؟

ابا نے سعدی کو بتایا تھا کہ شمع آپا سدا کی بیمار ہیں۔ انھوں نے زندگی کی کوئی بہار کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ ماں چلی گئی۔ بھائی بچھڑ گیا۔ مسلسل صدموں نے انھیں بیمار کر ڈالا۔ دل کا عارضہ ہوگیا۔ وہ اپنی تعلیم بھی جاری نہ رکھ سکیں۔ ہر وقت کی بیماری نے انھیں الگ تھلگ کر دیا۔ اور وہ اکیلی اداس اداس سی رہنے لگیں۔ اب جب کہ وہ آگیا تھا۔ شمع آپا کی بیماری نہ جانے کہاں چلی گئی۔

"برسوں بعد میری شمع مسکرائی ہے بیٹے! اس کے چہرے پر رونق آگئی ہے تم اس کو اداس رہنے نہ دینا۔ میں صرف اس کی خاطر جی رہا ہوں ——" یہ کہتے کہتے ابا کی بوڑھی آنکھوں سے آنسوں بہہ نکلے اور وہ دل پر اک بوجھ سا لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ دیر تک اسے نیند نہ آئی۔ اس کے دل میں شمع آپا کے لیے بے پناہ ہمدردی اور الم امنڈ آیا۔

"بے چاری! کتنی مجبور کتنی نامراد ہیں۔۔۔۔۔۔ میں انھیں کیا دے سکتا ہوں بھلا؟"

اسی دن سے سعدی ہر بات میں، ہر کام میں ان کی دل جوئی کرنے لگا تھا۔ کوئی طاقت تھی جو اُسے اُن سے قریب لے جا رہی تھی۔ وہ بے اختیار ان کی طرف کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ جانے یہ کیسے جذبات تھے۔ ایک گہرا اُنس ایک بے پناہ ہمدردی —— یا کچھ اور؟

ایک دن وہ پوچھ بیٹھا "آپ کی سب سے محبوب ہستی کون ہے؟" وہ چونکیں "جی —— ؟ وہ —— ابا کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟" انھوں نے سہارا ڈھونڈا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا "واللہ جواب نہیں!"

"کیوں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی بھلا —— ؟ ان کے علاوہ بھی تو ——" کہتے کہتے رک کر وہ گہری نظروں سے انھیں تکنے لگا۔ ان کی پلکیں جھپک گئیں۔ ہونٹوں پر تھرتھری سی آگئی۔ جیسے ہوا کے جھونکے سے بند کلی کانپ اُٹھی ہو۔

"نہیں بتائیں گی —— ؟" طویل خاموشی!

"اوہ سمجھا! آپ مجھ سے بھی چھپا رہی ہیں۔ جی ہاں میں کون ہوتا ہوں آپ کا۔ میں نے کیوں پوچھا تھا —— پتہ نہیں۔" وہ اداس ہوگیا۔

"سعدی تم اداس ہوگئے۔" پھول کی پنکھڑیوں پر اوس گر پڑی۔ ان کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ

کر رخساروں پر پھسل گئے۔

"تم کیا جانو۔ میرے دل میں کتنے گھاؤ ہیں ــــ کتنے غم ــــ دیکھو گے تو کانپ اُٹھو گے ــــ بس یوں سمجھ لو کہ دامن تار تار ہے۔ اور رفو کے قابل نہیں" ــــ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولیں۔

"میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"نہ سمجھو تو اچھا ہے ــــ میں بڑی نامراد لڑکی ہوں سعدی! میری زندگی میں کوئی خوشی نہیں آئی ــــ بہاروں کا نام سنا تو ہے۔ پر پھول کھلتے نہیں دیکھے۔ جانے اب تک کیسے جی لیا ــــ بڑی سخت جان ہوں ــــ موت بھی تو گلے لگاتے ڈرتی ہے ــــ ہاں!" وہ ہنسیں ایسی ہنسی جس میں کرب چھپا ہوا تھا۔

سعدی کی روح لرز گئی "آپ خواہ مخواہ یہ سب سوچتی ہیں ــــ کیا دوسروں کے دلوں میں غم نہیں ہوتے ــــ؟ صرف آپ ہی کو قسمت سے شکوہ نہیں ــــ مجھے بھی کئی غم ہیں ــــ کئی دکھ ہیں" وہ بہلانے لگا۔

وہ پھر مسکرائیں "سمجھا رہے ہو مجھے ــــ؟ نہیں سعدی! تم میرے غموں کو ہلکا کرنے کی کوشش نہ کرو ــــ مجھے ڈر ہے کہیں تم بھی اداس نہ ہو جاؤ۔ یہی کیا کم ہے کہ تمہاری موجودگی نے میرے غم کدے میں مسکراہٹیں بکھیر دی ہیں۔ ورنہ کہاں میں کہاں یہ رونقیں ــــ! تم نے پوچھا ہے۔ میری محبوب ہستی کون ہے ــــ کوئی میرا محبوب نہیں۔ میں کسی کی محبوب نہیں ــــ یہ سب سپنوں کی باتیں ہیں ــــ میری محبوب ہستیاں مجھ سے جدا ہو جاتی ہیں اسی لیے سب سے دور رہتی ہوں۔ کہیں میرا منحوس سایہ نہ پڑ جائے۔ تم۔ تم بھی میرے اتنے قریب نہ آ جانا کہ" ــــ وہ بات ادھوری چھوڑ کر وہاں سے چلی گئیں۔

پھر وہ رات ــــ چاندنی کا جادو چھایا ہوا تھا۔ نور کے ساغر چھلک رہے تھے۔ رات کی رانی مہک رہی تھی۔ اک بے خودی سی چھائی تھی۔ وہ سرو کا سہارا لیے کھڑی تھیں اور ان کی نظریں چاند کا طواف کر رہی تھیں۔ دل میں ایک ہیجان سا بپا تھا۔ پہلے تو یہ چاندنی یوں آگ نہیں لگایا کرتا تھا ــــ یہ آرزو۔ یہ بے تابی۔ کیسی ہے؟

"کیا سوچ رہی ہیں؟" سعدی کی آواز پر وہ چونک پڑیں۔

"سوچتی ہوں چاند کب تک جلتا رہے گا —— اکیلا —— چپکے چپکے۔"

"جب تک دل جلتے رہیں گے" —— وہ کہہ اُٹھا —— !

"دل کب تک جلتے رہیں گے ——؟" وہ ابھی تک چاند کو تک رہی تھیں۔ "دل؟"

وہ ایک لمحہ رُکا —— "جس دن یہ آگ بجھ جائے گی۔ وہ قیامت کا دن ہوگا۔"

"شمع بھی تو یونہی جلتی رہتی ہے نا! دل میں درد چھپائے۔ چپ چاپ ——" انھوں نے سعدی کو دیکھا —— اور اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاکر تیزی سے اندر چلی گئیں —— اور وہ سوچتا رہا —— کیا بات ہے۔ وہ بات کرتے کرتے کترا کر چلی جاتی ہیں۔ کبھی دل کے اندر جھانکنے کا موقع نہیں دیتیں —— کیا ان کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں —— اور یہ سوچتے سوچتے سعدی کا دل ٹوٹ سا گیا۔ وہ انجانے میں ان سے کتنا قریب چلا آیا تھا۔ قدم قدم چلتے وہ اس مقام پر جا پہنچا تھا۔ جہاں فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ پھر بھی فاصلے بدستور قائم تھے۔ شمع پیچھے ہی ہٹتی جا رہی تھیں —— دور بہت دور! لیکن اس نے تو فیصلہ کر رکھا تھا کہ اس نامراد لڑکی کے آنچل میں دنیا بھر کی مسرتیں ڈال دے گا۔ اس کے زرد زرد لبوں پر گلاب کے پھولوں کی سی تازگی بھر دے گا۔ اس کی اداس آنکھوں میں بہاروں کی بہاریں سجا دے گا۔ ہاں! وہ شمع آپا کو سہارا دے گا —— مستقل۔

چھٹیوں میں وہ کئی بار گھر بھی گیا۔ جب بھی وہ چلا جاتا گھر پر ویرانیاں سی چھا جاتیں۔ اور شمع آپا کے ہاتھ بند ہو جاتے۔ وہ کھوئی کھوئی سی چپ چاپ پھرا کرتیں۔ جیسے جانے والا اپنے ساتھ ساری مصروفیات بھی لے گیا ہو۔ ساری مسکراہٹیں لے گیا ہو —— پھر وہ اپنے پروگرام سے بہت پہلے اچانک ہی آ دھمکتا —— ان کے لبوں پر بھرپور تبسم ناچ اٹھتا۔ "آج تم بری طرح یاد آرہے تھے۔"

"آپ نے بلایا اور بندہ حاضر ——!" اور وہ تحفوں کے ڈھیر لگا دیتا۔ اور شمع آپا اس کے خلوص میں ڈوب جاتیں۔

پھر ایک دن خالہ امی آ پہنچیں۔ شمع آپا حیران رہ گئیں۔ انھوں نے خالہ کے قدموں تلے دل

بچھا دیا —— بہت دن بعد جو آئی تھیں۔ ابا کے مرجھائے ہوئے چہرے پر بہار آگئی۔ انھیں محسوس ہوا کہ فرض کا بوجھ ان کے ضعیف کندھوں سے سرک جائے گا۔

سعدی اپنی امی کے آگے شمع کے گن گاتے نہ جھجکتا —— اور شمع آپا ٹھٹک کر رہ جاتیں۔ خالہ اماں نے انھیں یوں ہنستا مسکراتا صحت مند دیکھ کر کہا۔ "ماشاء اللہ! تو تو اب بہت اچھی ہوگئی ہے۔ اب تو کوئی شکایت نہیں نا!"

"ہاں خالہ امی! خدا کا شکر ہے۔ میری بیماری جیسے آئی ہی نہ تھی۔"

اور سعدی کچھ یاد کر کے زیر لب مسکرا دیا۔ "اور اب کبھی آئے گی بھی نہیں امی!" اس نے یہ کہا اور شمع کو کنکھیوں سے دیکھا۔ انھوں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

پھر ایک دن رات کی تنہائی میں انھوں نے سرگوشی کی۔ "بیٹی! تجھ سے کچھ کہنا ہے ——"

شمع کے گال سرخ ہوگئے۔

"فرمائیے"

"سعدی کو تو جانتی ہے کتنا ضدی ہے۔ اپنی ضد کے آگے میری بھی نہیں سنتا"

شمع آپا کے دل کی دھڑکن غیر معمولی تیز ہوگئی —— آنکھوں کے سامنے مہندی کے گل بوٹے ناچ اٹھے:

"ایک بار "نا" کہہ دے تو پھر کبھی "ہاں" نہیں کرتا ——" وہ کہتی رہیں۔ "میں اس لیے تیرے پاس آئی ہوں —— تو غیر تھوڑی ہے! میں نے خان بہادر کے ہاں اس کی بات پکی کر لی ہے۔"

اڑا اڑا دھم —— شمعیں تیز تھپیڑوں سے کانپنے لگیں شیش محل چھنا کے کے ساتھ گرے اور چور چور ہوگئے۔

"بیٹی! میں کہہ سن کر ہار گئی ہوں۔ جانے کونسا جنون ہے کہ مانتا ہی نہیں۔ ادھر میری بات —— ادھر لڑکی کی عزت کا سوال۔ کیا کروں اب تو معاملہ تیرے ہاتھ ہے۔ وہ تجھے بہت مانتا ہے شمع۔ تو ہی اسے منا سکتی ہے —— میری لاج رکھ لے بیٹی ——!" خالہ اماں نے عاجزی سے کہا۔

ان کا سراپا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آنسوؤں کا ایک طوفان تھا جو پلکوں کی حدود توڑ کر بہہ نکلنے کو بے تاب تھا۔ شمع نے اپنے آپ کو سنبھالا "میں کوشش کروں گی خالہ امی ــــ آپ مطمئن رہیئے" اور خالہ نے ان کی پیشانی چوم لی۔

خالہ امی لوٹ گئیں ــــ اور شمع آپا نے چپ چاپ سعدی سے دور رہنا شروع کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں گھٹنے لگیں۔ چہرے پر ویرانی ہونٹوں پر بے نام سی چپ۔ آنکھیں اداس ــــ ان کی بیماری پلٹ آئی۔ وہ بستر کی ہو گئیں۔ ابا نے دل تھام لیا ــــ اور سعدی حیران۔ پریشان دن رات ان کی تیمارداری میں لگ گیا۔

"آپ کو اچانک ہو کیا گیا ہے ــــ آپ اس طرح اداس کیوں رہتی ہیں؟"

"میں تو ٹھیک ہوں۔ تمہیں وہم ہو رہا ہے بس!" وہ مسکرائیں۔

"اگر وہم ہی ہے تو آپ نے بستر کیوں سنبھال لیا ہے؟"

"کچھ دن آرام کرنا چاہتی ہوں سعدی! بہت تھک گئی ہوں" وہ دھیرے سے کہتیں سعدی زبردستی انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھیں۔ سعدی کی آنکھوں میں بے پناہ عجز دیکھ کر چلی گئیں۔ اور جب لوٹیں تو بھی نظریں چرا رہی تھیں۔ اور سعدی بھی! ڈاکٹر نے کہا تھا دل بہت کمزور ہو گیا ہے ــــ انھیں مکمل آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔

لیکن وہ شمع ہی کیا جس نے دوا پی ہو۔ وہ ساری دوائیں کھڑکی سے باہر الٹ دیتیں۔ اور جو سعدی نے پلائی وہی حلق سے اتری ــــ"

"بھئی یہ زہر تو اب نہ دو ــــ احسان ہو گا" وہ کراہ کر کہتیں۔

سعدی ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا "ایسی باتیں کر کے دل نہ دکھایا کیجیے"

"ہاں سعدی! میں نے سدا ہی دوسروں کا دل دکھایا ہے۔ تم بھی گوارا کر لو ــــ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ پھر نہ شمع رہے گی نہ جلن ــــ"

آپ کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ میں حیران ہوں آپ کی باتیں سن سن کر۔ یہ بیزاری ــــ آخر ــــ" سعدی اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ شمع بجھنے سے پہلے ایک بار بھڑک اٹھتی ہے نا ــــ!

ایسا ہی سمجھو سعدی۔" وہ اپنا کرب چھپا کر کہتیں۔" ہاں سعدی! تم سے کچھ کہنا ہے۔ بہت دنوں سے ایک آرزو کر رہی ہوں۔ میری تو کوئی بھی خواہش پوری نہ ہوئی۔ اب ایک امید ہے۔ جو تم سے وابستہ ہے ــــ کہو! پوری کرو گے؟" کہتے کہتے ان کی بیمار آنکھوں میں بلا کی بیچارگی اُمنڈ آئی۔ ایسی ہی جیسی باغباں کی آنکھوں میں اپنے چمن کو آگ دیتے ہوئے چھا جاتی ہے۔

وہ چونکا" مجھ سے وابستہ ہے ــــ! ایسی کیا آرزو ہو گی جو میں پوری کر سکونگا۔"

"کچھ بھی ہے ــــ تم وعدہ کرو تو کہوں۔"

"آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟"

"ضرور ہے اسی لیے تو تم سے کہہ بھی رہی ہوں۔ مرنے سے پہلے چاہتی ہوں کہ اپنی محبوب ہستی کو بھیّا کہہ کر پکاروں اور ــــ اور ایک پیاری سی بھابی لاؤں" سعدی گم سم سا انھیں تک رہا تھا اس کے لب سل گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بھیا ــــ بھابی ــــ اوہ ــــ

"تم نے ایک مرتبہ پوچھا تھا نا کہ میری محبوب ہستی کون ہے۔ کیا تم یہ سُن کر خوش نہیں ہوتے سعدی! میں نے اپنا ایک بھائی کھو دیا تھا۔ اس کا شفیق لمس اس کا پیار کھو دیا تھا ــــ تم ــــ تم یہ سب کچھ لوٹا دو مجھے۔ تم مجھے آپا کہہ کر ایک بار پکارو سعدی! تاکہ میری جنم جنم کی پیاسی روح سکون پائے۔ میں پیار کی بھوکی ہوں سعدی ــــ!" یہ کہتے کہتے انھوں نے سعدی کا ہاتھ تھام کر اُسے آنکھوں سے لگا لیا۔ اُن کی آنکھوں سے ایک سیلاب رواں تھا۔

"یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ــــ میں نے تو ــــ کچھ اور سوچا تھا" وہ اس سے آگے نہ کہہ سکا۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"جو کچھ سوچا تھا وہ غلط تھا سعدی ــــ! تم ابھی بچے ہو ــــ نادان ہو ــــ میرے بھیّا ــــ!"

اور سعدی۔ شمع آپا کا ہاتھ پکڑ کر سسک پڑا" شمع آپا ــــ! میں نے آپ کو کچھ بھی نہیں دیا تو دکھ بھی نہیں دوں گا۔

"میرے بھیّا ــــ!" وہ روتے روتے مسکرائیں جیسے برسات میں دھنک۔ سعدی جلدی سے منہ پھیر کر باہر نکل گیا۔

رات کو اُس نے سُنا شمع آپا کے کمرے سے ہلکی ہلکی پُر سوز آواز نکل کر فضا سے ٹکرا رہی تھی، ؎

روز مرنے کی مانگتے ہیں دعا
زندگی پھر بھی مختصر نہ ہوئی ؏

اور اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپک پڑے۔

اُس نے سوچا، شمع کی زندگی مختصر کب ہوتی ہے، وہ تو روز ہی جلتی ہے بجھتی ہے — پھر جلتی ہے۔ چپکے چپکے، جیسے چاند جلتا رہتا ہے۔ اور جس دن یہ آگ بجھ جائے گی وہ قیامت کا دن ہوگا۔ اور جیسے کسی نے اس کے دل میں کئی سارے کانٹے چبھو دیے۔ کاش! کاش وہ شمع کے سارے غم سمیٹ سکتا!!

○○

چراغ جلادو

"تم اپنی بچّی کی زندگی چاہتے ہو تو فوراً اس کی کینسر زدہ آنکھ نکالنے کی اجازت دے دو ــــ ورنہ کینسر اس کے سارے جسم میں پھیل جانے کا خطرہ ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے مسٹر، لیکن اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" سرجن گپتا نے بھرے گلے سے کہا۔

"ڈ ـــ ڈاکٹر!" باپ کی سسکی سینے میں ہی گھٹ گئی "تو ـــ تو کیا ـــ میری ننھی بچّی کی ایک آنکھ ضائع ہو جائے گی؟!"

"نہیں ـ نہیں ـــ" ممتا چیخ پڑی ـــ ایسا نہ کہو ـــ ایسا نہ کہو ـــ"

"میں نے کہا نا کہ یہی ایک راستہ ہے تمھاری بچّی کو بچانے کا ـــ ورنہ ـــ" اور ڈاکٹر نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بھئی، مجھے ایک چار سالہ بچّی کی کینسر زدہ آنکھ کو نکالنا ہے ـــ لیکن مجھے کسی اور مریض کو بھی ارجنٹ اٹنڈ کرنا ہے ـــ تم اس بچّی کا آپریشن کر دو ـــ اس کی دائیں آنکھ نکالنی ہے، ورنہ بچّی کے دماغ تک کینسر پھیل سکتا ہے، جس سے وہ مر سکتی ہے۔"

"دائیں آنکھ؟" ـــ سرجن کمار نے کیس کو سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں، دائیں آنکھ ـــ یو رِممبر

LEFT EYE ... NOTE DOWN PLEASE

"یس ڈاکٹر ــــ آئی وِل نوٹ ڈاؤن

"تھینک یو ــــ آئی ایم اِن اے ہری ــــ بائی!"

اور سرجن کمار نے اپنے ذہن کے کاغذ پر نوٹ کر لیا ــــ LEFT EYE

گوری چٹی گلاب جیسی خوب صورت چار سالہ سیمیں جو وارڈ بھر میں کھیلتی کودتی پھرتی ہے جو اپنی پیاری پیاری باتوں سے سب کے دلوں میں گھر کر چکی ہے۔ قسمت کی سفاکی سے بے خبر، آپریشن تھیٹر لے جائی گئی ہے۔ بند دروازے کے باہر بچّی کے ماں باپ اور عزیز جمع ہیں۔ چہرے بے رنگ اور پژمُردہ ــــ باپ کی آنکھوں میں خزاں کا سنّاٹا۔ اور ماں کرب کی صلیب پر لٹکی ہوئی ــــ قطرہ قطرہ مر رہی ہے۔ تین گھنٹوں کے طویل آپریشن کے بعد دروازہ کھلا ــــ ایک ایک کر کے ڈاکٹر، نرسیں ..... سبھی باہر نکلے ــــ اور جوں ہی سٹریچر پر بے ہوش سیمیں کو باہر لایا گیا ــــ ماں باپ دوڑے۔ دھڑکتے مچلتے دل ــــ اشکوں سے لبریز آنکھیں ــــ

اور دوسرے ہی لمحے ماں کی ہسٹریائی چیخ سے دل دہل گئے۔

"نہیں ــــ میری بچی کی بائیں آنکھ کہاں ہے؟ ــ میری بچّی کی بائیں آنکھ ــــ"

اور ایک بھونچال سا آگیا ــــ ایک قیامت ٹوٹ پڑی ــ اور حقیقت دودھ کے اُجلے پن کی طرح سامنے آگئی ــــ کہ ڈاکٹروں کی غفلت اور لاپروائی نے بچّی کی بھلی چنگی آنکھ نکال پھینکی ہے اور کینسر زدہ آنکھ رہ گئی ہے۔

اُمید کی ایک آخری کرن، ننھی سی لَو، جو جھلملا رہی تھی، وہ مایوسیوں اور نامرادیوں کی گہری کالی اماوس میں کھو کر رہ گئی ــــ چاروں طرف اندھیرا ــــ لامتناہی اندھیرا ــ ہے۔

زندگی کے اُفق پر کوئی کرن نہیں۔

سیپ خالی ہے ــ موتی بے رحم لہروں کے سنگین ہاتھوں نے لُوٹ لیے۔ سیاہی

کے ایک بیکراں سمندر میں ہاتھ پیر مارتی، ڈولتی ہوئی ایک ٹوٹی ہوئی نیّا ساحل سے دُور بھٹک رہی ہے۔ چلاّ رہی ہے۔

"چراغ جلادو ——— میں ماں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"چراغ جلادو ——— میں ماں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

چراغ ——— جلادو ———

اور اسپتال کے در و دیوار اور اس کے سارے مکیں اس چیخ سے دہل رہے ہیں۔

○○

انتظار اور ابھی

۔ آج جانے کیا بات ہے تم بہت یاد آ رہے ہو۔ ۔ ۔ رہ رہ کر دل کے آنگن میں تمہارے
قدموں کی مانوس چاپ گونجنے لگتی ہے، ۔ ۔ ۔ اور میری اداس آنکھوں میں خوشی کی ان گنت شمعیں سلگ اٹھتی
ہیں ۔ ۔ ۔ دھڑکنیں پکار اٹھتی ہیں ۔ ۔ ۔ تم آ گئے! سانسیں کہہ اٹھتی ہیں ۔ ۔ ۔ تم آ گئے۔۔!! گھر کے در و دیوار سرگوشی
کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ تم آ گئے!!! ۔ پھول کلیاں جھوم کر کہتی ہیں۔ تم آ گئے ۔ تم آ گئے ۔ ۔ ۔ اور میں دوڑ کر صدر
دروازے تک جا پہنچتی ہوں ۔ ۔ ۔ زیر و زبر دھڑکنیں ۔ ۔ ۔ بے قابو سانسوں کا طوفان ۔ ۔ ۔ بے تاب
نگاہیں ۔ لیکن ۔ وہاں کوئی نہیں ہے ۔ کوئی نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ! دل سسک اٹھا، تم نہیں آئے۔
پھول کلیاں ۔ ۔ ۔ در و دیوار ۔ ۔ ۔ سب چپکے چپکے دہرانے لگے ۔ ۔ ۔ تم نہیں آئے ۔ ۔ ۔ تم نہیں آئے ۔ ۔ ۔
اور میں اپنا زخمی وجود سنبھالے اپنے کمرے میں پلٹ آئی ہوں ۔ ۔ ۔ یہ کمرہ ۔ ۔ ۔ تمہارا کمرہ، ۔ ۔ ۔ سجا سجایا
۔ ۔ ۔ شیش محل جیسا کمرہ، ۔ دیواروں پر تمہاری اور میری بڑی بڑی تصویریں مسکرا رہی ہیں ۔ ۔ ۔
اور یہ تمہارا پورٹریٹ ہے! جیسے تم خود یہاں دیوار سے چپکے سے لگے کھڑے منتظر ہو کہ کب میں پاس
آؤں اور تم لپک کر اپنی بانہوں کے حصار میں لے لو ۔ اور میں ۔ ۔ ۔ میں گھبرا کر ۔ ۔ ۔ چونک کر تمہارے
سینے سے لگ جاؤں ۔ ۔ ۔ ہے نا! اور یہ ہماری مسہری ہے! قیمتی لکڑی کی منقش مسہری ۔ آئینے کی طرح شفاف،
رنگین جالی سے ڈھکی، ۔ اور یہ بے داغ ریشمی بستر، یہ چادریں ۔ ۔ ۔ یہ مہکے مہکے تکیے ۔ ۔ ۔ انھیں
تمہارا انتظار ہے ۔ کھڑکیوں کے مہین نیلگوں پردے باہر باغ سے آتے ہوئے جھونکوں
سے اٹکھیلیاں کر رہے ہیں۔ تمہیں کیا پتہ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا کہ تم چھوڑ گئے ہو ۔ سب کچھ وہی

ہے اپنے مقام پر۔ روز ہی صبح مسکراتی ہے۔ چنبیلی کھلتی ہے ۔ چمن میں بہار آتی ہے۔ روز ہی زندگی اپنی ساری رنگینیاں لے کر آتی ہے ... لیکن تم ... تم نہیں آتے۔ تم نہیں آتے !!

کیوں میرے محبوب؟ تم نے تو کہا تھا جلد ہی واپس آؤں گا... لیکن اتنے سارے دن گزر گئے ہیں... جیسے ایک صدی ایک دن بیت گیا ہو، میری زندگی پھیکی پھیکی سی سونی سونی سی ہے تمہارے بنا ۔ تم نہیں تو زندگی نہیں ـــــ جانِ من! اب اتنی بھی کیا مصروفیت،... ایسا بھی کیا کام کہ مہینے بھر سے گھر کی یاد نہیں آئی۔ سچ کہنا، کسی کی یادوں کے جھونکے کوئی سندیس نہیں لاتے؟ چاند کچھ نہیں کہتا ۔؟! ستارے بھی کچھ نہیں کہتے ؟!

جانے کیوں،... رہ رہ کر تمہارے قدموں کی چاپ دل کے آنگن میں گونجنے لگتی ہے اور میں صدر دروازے کی طرف لپک جاتی ہوں،... پھر مایوس ہو کر اپنا زخمی وجود سنبھالے بوجھل قدموں واپس چلی آتی ہوں۔ تم نہیں آئے... تم نہیں آئے ۔ نہ تم آئے نہ کوئی خط۔ میرا دل اتنی زور سے کیوں دھڑکنے لگا ہے... اک خوف سارگوں میں اترنے لگا... جیسے زہر سا گھول دیا گیا ہو۔ تم کیوں نہیں آئے۔ کیوں نہیں !! ـــ میں ہر پل تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی ہوں۔ تمہاری واپسی کی التجائیں کرتی ہوں۔ سجدے میں پڑے پڑے ہزاروں آنسو بہا ڈالتی ہوں۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو جانے کون کون سی دعائیں دل کی زبان سے نکلنے لگتی ہیں۔ دل بھر بھر آتا ہے ۔ ایسا کیوں؟ ایسا کیوں؟! میرے ہمدم! اب کسی بھی طرح وہاں سے چلے آؤ ـ بخدا ـ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ میری روح لرز اٹھتی ہے۔ تم وہاں تنہا ہو۔ نہ ساتھی نہ غمگسار ـــ جانے کن حالات میں گرفتار ہو ـ جانے کہاں ہو؟ کیسے ہو! میری زندگی! ایک خوف ایک دہشت سی طاری ہے مجھ پر! بُرے بُرے خواب نظر آتے ہیں۔ تم نے مہینہ بھر سے خط کیوں نہیں لکھا؟ ـــ کوئی خبر بھی نہیں بھیجی۔ یہاں امّی ـ بابا، بہنیں سب کو تمہارا خیال ہے سب تمہارے لیے حیران و پریشان ہیں۔ سب کو تمہارا انتظار ہے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے میرا تصوّر تمہارے ہی گرد گھومتا رہتا ہے۔ جیسے طواف کر رہی ہوں ـــ تم ـــ تم کہاں ہو؟! ـــ ان سب کی آنکھوں میں خوف کا طوفان سا چھپا نظر آتا ہے۔ لب بھینچے ہوئے، چہرے متاسف سے، کیا بات ہے؟ ارے کوئی تو کہو تم سب اتنے خاموش کیوں ہو؟! کوئی نہیں بتاتا۔ بات

کیا ہے، میں ایک ایک سے پوچھتی ہوں۔ جھنجوڑتی ہوں۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ "کچھ نہیں صوفی بچی نہیں ایسے ہی اعزاز کی کوئی خبر نہیں ملی نا اس لیے پریشان ہیں۔" اعزاز — اعزاز — میرے اعزاز — تم اپنی کوئی خبر دو — یا خود چلے آؤ — چلے آؤ — ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی، مر جاؤنگی۔ تمہاری فکر نے چین وسکون کے سارے پھول جھلس ڈالے ہیں۔ تمہارے غم نے روگ دیے ہیں چنگاریاں بھر دی ہیں — یہ آرام دہ بستر پتھر کا بن گیا ہے ... یہ عالیشان کوٹھی کانٹوں سے بھر گئی ہے ... پائیں باغ سے آتی ہوا صحرا کی گرم لُو کی طرح جھلسا دینے والی — تم جو نہیں ہو — تم۔ خدا ہی جانتا ہے وہاں اُس سرزمین پر کیا کچھ بیت رہا ہے ... جبر و تشدّد کے ناگ کتنے معصوم انسانوں کو زندہ نگل چکے ہونگے ... بربریت کی اُس مسموم فضا میں جانے کتنے ان گنت انسان دم توڑ رہے ہیں — یہاں تو ہماری ہر حرکت پر پہرا ہے۔ نہ ہم کچھ پوچھ سکتے ہیں نہ کہہ سکتے ہیں — زبان پر، سانس پر — ہر حرکت پر پہرہ ہے ... قدرت کی دی ہوئی سانسوں اور زبان پر پہرہ ہے! زبان کھولی نہیں کہ گولی سینے کے پار ہوگئی۔ فضاؤں میں ہزاروں بجلیوں کی بازگشت لے گئی ہے، آسمان دہل رہا ہے — زمین دہل رہی ہے! ایسے میں تم پردیس میں ہو ہم سب سے دُور، اس مقام پر جہاں رات دن توپیں گرج رہی ہیں۔ آگ برس رہی ہے — لہو کی ندیاں بہہ رہی ہیں — ہائے بس نہیں چلتا کہ اڑ کر آجاؤں۔ تمھیں کھینچ کر اپنے ساتھ لے آؤں!!

تم وہاں ترقی دے کر چیف انجینیئر کے عہدے پر بھیجے گئے ہو — کِسے معلوم تھا کہ تمہارے وہاں پہنچنے کے فوراً بعد ہی وہ ملک جنگ کی آگ میں سلگ اٹھے گا ورنہ میں — میں تمھیں کبھی نہ جانے دیتی — تمہارے پیروں میں بانہوں کی زنجیریں ڈال دیتی۔ اللہ۔ اللہ تو ہی حافظ و نگہبان ہے۔ میرے سہاگ کا — میری زندگی کا۔

میں دیکھ رہی ہوں بابا تمھارا پتہ پوچھتے رہتے ہیں ... تمھارے متعلق دریافت کرتے رہتے ہیں۔ وہ پاگلوں کی طرح سارا دن شہر میں اس جگہ سے اُس جگہ پھر پھر کر تمہاری خبر پوچھ آتے ہیں — ! تمھارا کوئی پتا نہیں — تم کھو گئے ہو — میں کہاں ڈھونڈوں تمھیں؟!

اُمّی سجدے سے سر نہیں اٹھاتیں۔ باجی۔ بھیّا سب کے سب تمہارے لیے دیوانے

ہو رہے ہیں ۔ جتنی اور جیسی دعائیں مانگنی ہیں مانگ رہے ہیں ۔ منتیں مرادیں کر چکے ہیں ۔ میں سکتے میں ہوں پتھر بن گئی ہوں ۔ میری پھٹی پھٹی آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں ۔ اور کان تمہارے قدموں کی چاپ پر!

آجاؤ میرے محبوب! ظلم کی اُس بستی سے نکل کر میرے پاس آجاؤ ۔ اپنی صوفی کو زندگی دے دو ۔ ہائے وہ کیسی گھڑی تھی ۔ جب تم نے گھر کی دہلیز سے قدم نکالا ۔ منحوس ساعت! ۔ کاش وہ گھڑی نہ آتی ۔ میں اس سے پہلے کہ تم قدم اٹھاتے تمہارے قدموں میں مر جاتی ۔ تمہارے قدموں میں میری زندگی تمام ہو جاتی ۔ مگر ۔ مگر ۔ قسمت کا لکھا کس نے مٹایا ہے ۔ ؟ اُس نراس کے تانے بانے بنتے بنتے دن ڈھل رہے ہیں، کوئی آتا ہے تو چونک اٹھتی ہوں ۔ شاید تم آگئے!! شاید تمہاری خبر آئی ہے؟ کوئی تو آئے جو تمہاری خبر دے ۔ اے چاند ستارو ۔ اے کلیو ۔ اے ہواؤ ۔!!

تب ایک اندھیری شام، تمہارے دوست اعظم آگئے ... میں پردے کے پاس آکھڑی ہوں ۔ چاہتی ہوں اعظم کے پاس جاؤں اور تمہاری خبر پوچھوں ۔ ارے ۔ یہ کیا؟ بیٹھے بیٹھے بابا چکرا کر بے ہوش ہو گئے ۔ امّی ۔ بھیا! ارے دیکھ کر تو آ بابا کو کیا ہوا ۔ اعظم نے کیا کہا ۔ کیا کہا؟! کوئی کہہ دو ۔ کہہ دو مجھ سے کہ اعظم نے کیا خبر دی ۔ کیا بتایا ہے ۔ میں چیخ رہی ہوں ۔ پاگلوں کی طرح چلا رہی ہوں ۔ اور جب بابا کو ہوش آیا ۔ تو بچوں کی طرح رونے لگے ۔ "اب ۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا بیٹی! کبھی نہیں آئے گا ۔ وہ ۔ وہ ہم سے روٹھ گیا ہے ۔ کھو گیا ہے ۔ میری بچی!" میرے ذہن میں توپوں کی گھن گرج کا شور سما گیا ہے ۔ نہیں ۔ ؟ میری چیخ اتنی ڈراؤنی ہے کہ میں خود سہم گئی ہوں ۔

اعزاز ۔ اعزاز یہ میں کیا سن رہی ہوں ۔ کہ تم ۔ تم دشمنوں کے فریب کا نشانہ بن گئے ۔ نہیں نہیں ۔ تم زندہ ہو ۔ سلامت ہو ۔ کوئی تمہیں مار نہیں سکتا ۔ کوئی تمہیں قتل نہیں کر سکتا ۔ میں نے خدا سے رو رو کر تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگی ہیں ۔ اپنے سہاگ کی دعائیں مانگی ہیں ۔ تم ۔ تم زندہ ہو ۔ زندہ رہو گے اعزاز ..... اعظم نے بتایا کہ جس دن جنگ بند ہوئی تھی ... اس دن ۔ ہاں اُسی دن دشمنوں نے تمہیں بھی دھوکہ دیا ۔ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ

کسی دوسری جگہ پر منتقل ہو رہے تھے۔ ایک ایک کر کے تم نے کئی لوگوں کو محفوظ مقام پر بھجوایا اور سب سے آخر میں اپنے آفس کے دو اور ساتھیوں کو لے کر تم اپنی جیپ میں آ بیٹھے تھے ـــــ کہ تم بھی وہاں پہنچ جاؤ ـــــ اور جیسے ہی جیپ اسٹارٹ کی۔ ٹائم بم پھٹ پڑا ـــــ دھماکے کے ساتھ جیپ اڑ گئی ـــــ تم زخمی ہو گئے تھے ـــــ تمھارے ساتھی بھی ـــــ سب کو ہسپتال لے جایا گیا۔ مہینہ بھر تم اسپتال میں اکیلے پڑے تڑپتے رہے ـــــ آہ ـــــ آہ! کتنی بے بسی، کتنی بے چارگی ہو گی ـــــ کسی نے ہمیں اطلاع نہ دی۔ پتہ ہوتا تو ہم جان ہتھیلی پر رکھ کر بھی تمھارے پاس پہنچ جاتے۔ یا تمھیں لے آتے۔ تم زخمی حالت میں کراہتے رہے۔ اور ہم ـــ تم سے دور ـــ تمھاری سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔ کیا مشرقی بنگال تمھارے لیے کربلا بن گیا تھا اعزاز؟ حضرت امام حسینؓ کو جس طرح کربلا میں شہید کیا گیا تھا۔ اُسی طرح تمھیں بھی پردیس میں شہید کیا گیا ہے بے بس تنہا۔ مجبور۔ اعزاز! کیا اب کبھی میں تمھیں نہیں دیکھ سکوں گی تم تو ہنستے مسکراتے خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلے تھے۔ تم تو ترقی پر وہاں گئے تھے۔ جلد مجھے بھی لے جانے کا وعدہ کیا تھا تم نے، نہیں نہیں۔ یہ جھوٹ ہے ـــ کہ تم ـــ تم ـــ آہ! میں کہاں ڈھونڈوں تمھیں ـــ کہاں دیکھوں تمھاری وہ صورت۔ کہاں سنوں گی وہ آواز۔ تو کیا۔ اب سب کچھ ختم ہو چکا۔ سب کچھ مٹ گیا ہے!! اے دنیا والو۔ سنو ـــ میں پوچھتی ہوں تمھیں کیا حق تھا کہ تم نے ایک بے گناہ معصوم انسان کی جان لے لی۔ تم نے میرا سہاگ کیوں چھین لیا؟ تم ـ ظالم ہو ـ جابر ہو۔ وطن کے نام پر ـ زمین کے نام پر کروڑوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والو ـ ہزاروں لاکھوں کو لہو کا غسل دینے والو ـ ماؤں کی گود خالی کرنے والو۔ بہنوں کی چوڑیاں چور چور کرنے والو ـــ تم تم انسان نہیں ہو شیطان ہو۔ تم قاتل ہو ـ قاتل ـ ایک دن تم کو بھی منصفِ اعلیٰ کے سامنے جواب دینا ہو گا اس بارِ الٰہی کے سامنے جس نے تمھیں اشرف المخلوقات کا شرف بخشا۔ بتاؤ کیا کہو گے کہ تم نے اس کی زمین کو دوزخ کا نمونہ بنا رکھا تھا ـــ خون کی ہولیاں کھیلیں اور بھائی بھائی کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے؟! تم نے ایک نہیں کتنے ہی اعزازوں کا خون کیا۔ کتنی ہی صوفیاں اپنے اعزاز کی راہ تکتی رہ گئیں ـ؟!

یہ میری آنکھوں کے سامنے دھواں سا کیسا اٹھ رہا ہے، ـــ پھیل رہا ہے فضا میں کیسی

گھٹی گھٹی چیخیں ہیں! یہ کیسی بُو ہے۔ لہو کی بُو۔ دھوئیں کی چادر کے پرے یہ سُرخ سُرخ سے دھبے کیسے ہیں!۔ جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتے جا رہے ہیں ۔۔۔ ارے۔ یہ تو دریا ہے۔ لہو کا دریا۔ لہروں میں ڈوبتی ابھرتی لاشیں ہیں ___ لاشیں ___ نہیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لی ہیں۔۔۔ اور چلا رہی ہوں ۔۔۔ مجھے بتاؤ اے دنیا والو کہ میں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا؟ تم نے زمین کے ٹکڑے کیے تو کیے دلوں کو بھی گولیوں کی زد پر رکھ دیا؟! تمھارے ہاتھوں پر لگا ہوا یہ لال قاتل رنگ قیامت تک نہ چھوٹے گا۔ تم نے ہزاروں صوفیوں کو پاگل بنا ڈالا ہے۔ آؤ آؤ ایک خون اور سہی۔ اپنے ہاتھوں کا رنگ اور گہرا کر لو۔ مجھ کو بھی بم سے اڑا دو۔ میرے بدن کو بھی زخموں سے چور کر دو۔ بکھیر دو۔ ریزہ ریزہ کر دو۔ یہ زمین کس کس کے لہو میں نہا چکی ہے اور کس کس کے لہو میں اس کو نہانا ہے؟! آہ اعزاز آؤ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ ___ میں تمھارے بغیر ایک پل زندہ نہ رہ سکوں گی۔ یہ زندگی جہنم سے کم نہیں ہے۔ مجھے بھی اس جہنم سے نجات دے دو۔ اعزاز۔! میں کیسے یقین کر لوں کہ تم اب دنیا میں نہیں ہو۔ کیسے مان لوں کہ تمھیں دیکھا تک نہیں۔ نہ زخمی حالت میں ۔۔ نہ ۔۔ نہ موت کی دہلیز پر سسکتے ہوئے۔ میں نے تمھیں سجا سنوار کر پوری تیاری کے ساتھ روانہ کیا تھا! آہ اعزاز۔ تمھارے دوست نے تمھارے لباس، تمھاری چیزیں یہاں پہنچائی ہیں ___ آہ یہ چیزیں!۔ یہ تمھاری ہیں تم نے انھیں چھوا ہے۔ اِن میں تمھاری خوشبو ہے۔ تمھارا لمس سمایا ہوا ہے۔ میں اِن چیزوں کو سینے سے لگا کر پیار کرتی ہوں۔ آنکھوں سے لگاتی ہوں۔ روتی ہوں اب تم کہاں؟! تمھارے ساتھ سب بہاریں چلی گئیں۔ ہونٹوں کا تبسّم۔ آنکھوں کی روشنی۔ دل کی دھڑکنیں۔ سب چلی گئیں۔ تمھاری سجائی ہوئی عالیشان کوٹھی گورستان لگتی ہے۔ یہ ہوائیں سسکتی ہیں۔ تمھارا ماتم کرتی ہیں۔ چنبیلی آہیں بھرتی ہے۔ گھر کی ہر شئے تمھاری یاد میں گم صم ہے۔ پاگل ہے۔ اور میں۔ دیوانوں کی طرح۔ تنہا۔ زخمی دل۔ زخمی روح، مردہ جسم لیے جی رہی ہوں۔ رہ رہ کر تمھاری آوازیں کانوں میں گونجتی ہیں اور میں دوڑ کر صدر دروازے تک چلی جاتی ہوں۔ وہاں کوئی نہیں ہوتا! اور میں اپنا زخمی وجود سنبھالے اپنے ویران کمرے میں پلٹ آتی ہوں ۔ ۔ ۔ کیا۔ تم کبھی نہ آؤ گے؟! کبھی نہ آؤ گے؟!!

سوکھی پیاسی دھرتی

پیاس،... پیاس ـــ! پیاس... !!

اُس کی سوکھی پیاسی دھرتی کب سے جھلس رہی ہے۔ نہ ارمانوں کا کوئی جھونکا اُسے لہکاتا ہے نہ آرزوؤں کا کوئی بادل ہی برستا ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں۔ بادل اُمنڈ کر آتے ہیں۔ سوکھی دھرتی مُنہ کھولے ایک ایک بوند کی منتظر ہے، بادل بن برسے ہی کُھل جاتے ہیں۔ پیاس بڑھتی جاتی ہے۔ حلق سوکھ رہا ہے۔ ریگ زارِ زندگی پر ہانپتے کانپتے قدم اٹھ رہے ہیں۔

پیاس ـــ پیاس !! سینے میں اک آگ سی لگی ہے۔ آنکھوں میں اک آگ سی۔ دور دور تک صحرا ہی صحرا ہے ـــ سراب ہی سراب ۔

کون یہ پیاس بجھائے گا ؟ !

دل کی کلیاں کون کھلائے گا ؟

کس کو پروا ہے، ہاتھ میں تعلیمی سند لے کر وہ کوچہ کوچہ در بدر بھٹکتا پھرتا ہے۔ در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ "نو ویکنسی" کی دل خراش آوازوں نے اس کا دل توڑ دیا ہے۔ افسروں کی منتیں کیں ـــ امیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ سب وعدے کر کے مکر گئے۔ اب وہ تقریباً ناامید ہو چکا تھا۔ ضعیف باپ سے آنکھیں ملاتے کتراتا۔ بیمار ماں کو جھوٹے دلاسے دیتے دیتے تھک چکا تھا۔ بہن بھائی سے کیے ہوئے وعدے اس کا منہ چڑانے لگتے۔

بیمار امی کب تک اپنے ناتواں کندھوں پر بوجھ اٹھاتی رہیں گی ؟ اسکول اور گھر کے چکر میں

وہ پس رہی تھیں ــــ بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے اُن کا سینہ راکھ ہو چکا تھا۔ وہ اب نوکری کرنے کے قابل بھی نہ رہی تھیں مگر وہ کس منہ سے کہتا کہ امّی! اب نوکری چھوڑ دیں ــــ وہ دن کب آئے گا؟ ــــ وہ سورج کب نکلے گا؟ جب وہ زندگی کے اندھیروں کو شکست دے سکے گا۔ اور تقدیر کے سونے ماتھے پر خوشیوں کا دمکتا ہوا جھومر سجا سکے گا۔

وہ دن کب آئے گا۔! اس کے پاس تو ماں کے کندھوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا! ایک انجینئرنگ کا ڈپلوما تھا۔.. جو برسوں کی محنت سے حاصل کیا گیا تھا۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا ــــ جس کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ نوکری کس بل بوتے پر حاصل کرتا۔ اس کے پاس نہ کوئی سفارش تھی اور نہ روپیہ۔ نوکری کے خواب کب کے ٹوٹ کر بکھر چکے تھے۔ پھر بھی ایک آس تھی جو وہ اس کاغذ کے ٹکڑے کو گلے سے لگائے لگائے پھرتا تھا!

شاہد کے والدین عزت دار کھاتے پیتے گھرانے کے تھے لیکن بُرا وقت آیا تو ساری جایداد سوتیلے بھائیوں نے ہتھیالی ــــ اور عزت کے نام پر مرنے والے شاہد کے ماں باپ ننھے ننھے بچوں کا ہاتھ تھام کر اپنے گھر سے نکل آئے۔ صبر و شکر کا دامن تھام لیا اور الگ گرہستی بسا کر اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم میں خون پسینہ ایک کر دیا! بابا نے چھوٹے موٹے کاروبار شروع کر دیے۔ امّی نے میٹرک کی سند کا سہارا لے کر نوکری کر لی۔ اور یوں زندگی کی گاڑی چل پڑی۔ چلتی رہی۔ چلتی رہی۔

"میرا لال بڑا ہو جائے! پڑھ لکھ جائے تو ہمارے دن پلٹ جائیں گے۔" پائی پائی جوڑ کر اس کی فیس ادا کی جاتی۔ دو وقت کی روکھی سوکھی کھا کر بیٹے کے لیے اچھا لباس بنواتے۔ کہیں اسکول میں اس کی سُبکی نہ ہو لڑکے اس کا مزاق نہ اُڑائیں۔ اُسے اپنی غربت کا احساس نہ ہو۔ بابا امّی بچوں کے سامنے کبھی اپنی مجبوریوں کا ذکر تک نہ کرتے۔ اشارے کنایوں میں بات کرتے۔ یوں اپنی ساکھ قائم رکھے ہوئے تھے کہ کسی کے آگے ہاتھ بھی نہ پھیلاتے!!

اور اب لڑکا جوان ہو گیا۔ اس کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ تو ماں باپ کی آنکھوں میں سنہرے رنگ بکھر گئے۔ سکھ چین کی زندگی بتانے کے خواب پلکوں میں اتر آئے۔ دل کے آنگن میں ارمانوں کی برائیں اُترنے لگیں ــــ "اللہ! میرے بچے کو اچھی سی نوکری پر لگا دے! میرا بیٹا ہماری

زندگی کی ناؤ کو سنبھال لے۔ اپنی دو بہنوں کی مانگ بھر دے۔ بھائی کا ہاتھ تھام لے۔ بابا اور امی دعاؤں کے چراغ جلانے لگتے۔ امی کی پرانی کھانسی نے انھیں الگ مجبور کر رکھا تھا۔ دو قدم چلتیں تو دم پھولنے لگتا۔ چھوٹی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر چلتیں۔ پسینہ پسینہ ہو جاتیں۔ مگر ایک فرض تھا جو انھیں تھک کر بیٹھنے نہ دیتا وہ برابر اسکول کی ڈیوٹی پوری کرتیں اور شام کو گھر پہنچتیں تو بستر پر پڑ جاتیں۔ یوں محسوس کرتیں کہ اب وہ کبھی بھی اُٹھ نہ پائیں گی۔ لیکن جوں ہی بیٹے کی آہٹ سنتیں مشین کی طرح اٹھ کر بیٹھ جاتیں کہیں میرا بچہ پریشان نہ ہو جائے۔ سارا دن کتابوں میں سر کھپاتا ہے نا!

"آ گئیں امی! تھک گئیں نا — بس امی چند دن اور — پھر میں آپ کو آرام سے رکھوں گا" وہ پیار سے امی کے گلے میں باہیں ڈال دیتا۔

"ہاں بیٹا!! خدا کرے وہ دن جلد آئے" وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں "چلو تم کچھ کھا لو!" بہن ٹرے میں چائے بسکٹ لے آتی — سب مل کر ہنستے بولتے مستقبل کے خواب سجانے لگتے۔

اور اب ڈپلوما حاصل کیے بھی تو دو سال گزر گئے تھے۔ سہانے خواب ابھی تک خواب ہی تھے۔ کوئی سپنا سچ نہ ہوا۔ کوئی ارمان ابھی پورا نہ ہو سکا۔ بابا کی ضعیفی، امی کی بیماری دو بہنوں کی سونی کلائیاں۔ بھائی کا فرض — اور خود وہ بیکار۔ مخلص اور زندہ دل۔ یہ مصیبت کو ہنس کر جھیلنے والا شاہد۔ آج کتنا بے سہارا اور ٹوٹا بکھرا ہے۔ اُسے تو خود اپنے وجود کو سمیٹنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ اپنے بکھرے کنبے کو کیا سمیٹ سکتا ہے۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے ایسے میں بنگلور کی کسی فیکٹری سے اُسے انٹرویو آ گیا۔ مارے خوشی کے وہ ناچ اُٹھا۔ جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو۔ سوکھی دھرتی پھر ایک بار حسرت سے آسمان کو تکنے لگی۔ بادل جھوم جھوم کر آنے لگے۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں "امی! مجھے انٹرویو آ گیا ہے۔ بابا دعا کریں کہ کامیاب ہو جاؤں" بابا کے جھریوں دار چہرے پر شفقت پھوٹ پڑی۔

"اے پروردگار! میرے بچے کی زندگی سنوار دے۔ میرے لال کا مستقبل شاندار بنا دے"

اُمی نے سینے سے لگا کر دعائیں دیں۔ سب نے دعاؤں کے پھول بکھیر دیے۔ عیدر

رمضان قریب تھی۔ بڑی آرزوئیں امیدیں لے کر وہ سفر پر نکل گیا۔ اور جب واپس آیا تو خوشیوں کی سوغات لے کر آیا۔" بابا۔۔! میں سلیکٹ ہو گیا ہوں۔"

"امّی۔ میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ پورے پانچ سو روپیہ تنخواہ ملے گی آئندہ پھر ترقی بھی ہو گی۔" وہ اپنے ماں باپ کے قدموں پر جھک گیا۔

"یا اللہ! تیری ذات بے نیاز ہے تو نے مایوس دلوں کو زندگی بخش دی۔" امّی نے بلائیں لیں۔ بہنیں لپٹ گئیں۔" مبارک ہو بھیّا! مٹھائی کھلائیں نا۔"

"ہاں ہاں! وہ تو میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا۔ آرڈر تو آ جانے دو۔"

بابا فوراً شکریے کی نماز کے لیے اٹھ گئے۔" یہ عید حقیقی معنوں میں ہماری عید ہے۔" مستقبل کے سنہرے رنگ تتلیوں کی طرح لہرا اٹھے۔"

شاہد کو جلد ہی نوکری کا آرڈر بھی مل گیا۔ دوست احباب نے مٹھائی کھائی۔ خاندان بھر میں خوشیوں کا دور دورہ تھا! عید بھی آگئی۔ وہ دو چار دنوں میں ڈیوٹی پر جانے والا تھا! سفر کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ امّی نے کہیں سے قرض لے کر شاہد کے دو تین جوڑے بنوا دیے۔" بیٹا! فیکٹری میں سپر وائزر بن گیا ہے۔ دوستوں میں عزت رہ جائے گی۔ پہلی تنخواہ مل جائے تو قرض ادا کر دوں گی

شاہد نے کہا۔" امّی!! بس میری پہلی تنخواہ ملتے ہی آپ نوکری سے استعفیٰ دے دیں۔ میں بنگلور میں آپ کا ٹھیک علاج کرواؤں گا۔ اگر کوئی اچھا سا مکان مل جائے تو آپ سب کو وہیں بلوا لوں گا۔"

"ہاں بیٹے! خدا جلد وہ دن دکھائے۔" امّی کی پلکیں بھیگ گئیں۔

"میں شانو اور ریشماں کی شادی بھی دھوم سے کروں گا آپ فکر نہ کریں۔ ان سب کے خواب پورے کروں گا انشاء اللہ!" اور روح کے تار جھنجھنا اٹھے۔

وقت کب کیا دکھاتا ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ انسان کو وقت کے ہاتھوں پت جھڑ کے پتوں کی طرح بکھرنا بھی پڑتا ہے! طوفانی ہواؤں کے دوش پر بے سمت کی منزلوں کا سفر بھی کرنا پڑتا ہے۔

وقت نے اچانک ہی اپنا کھیل شروع کر دیا۔ چند مفاد پرستوں نے شہر کی فضا کو مسموم کر دیا۔ سورج کی کرنوں نے دیکھا کہ پورا شہر آگ میں جھلس رہا ہے۔ انسان انسان کے

سینوں میں خنجر بھونک رہا ہے ــ گردن کاٹ رہا ہے ۔ بارود کے ڈھیر کے ڈھیر آتش فشاں کی طرح پھٹ رہے ہیں ۔ لوٹ مار ۔ قتل و غارت گری ۔ کسی کا گھر جلایا جا رہا ہے ۔ کسی پر تیزاب پھینکا جا رہا ہے ــ ہتھیاروں سے لیس ہو کر آوارہ غنڈے معصوم اور بے گناہ لوگوں پر حملے کر رہے ہیں ۔ خون کی ندیاں بہہ اٹھیں ۔ آگ ہی آگ ، ــ دھواں ، ــ تاریکی چیخ و پکار ! سارا شہر فرقہ پرستی کے شعلوں میں دہک اٹھا ہے ۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں ، کہ کیا ہو رہا ہے ۔ کیوں ہو رہا ہے ؟ ہر کوئی ایک دوسرے سے خوف کھا رہا ہے ۔ نہ جانے کون کس کا دشمن ہے ۔

" امّی ۔ ذرا دیکھوں ۔ میرے دوست بلا رہے ہیں " شاہد باہر جانے لگا ۔

" نہیں بیٹے ۔ باہر مت جانا ۔ خدا کے لیے میرے بچے ! " ماں گھبرائیں ۔

" ابھی آیا امّی ! " اور ایک شیر فوراً گھر سے باہر نکل گیا ۔

" ارے دیکھو تو ۔ شاہد کہاں گیا ۔ بھئی بچیوں کو جھانکنے نہ دینا ۔ رحم خدا رحم " !

بابا کانپ اُٹھے ــ امّی مصلے پر جھک گئیں ۔ بابا نے کلام اللہ سر پر رکھ لیا ۔

" پروردگار ! ہم بیکسوں پہ رحم کرنا ــ میرے مالک "

اور تبھی ایک زوردار دھماکہ ہوا ــ خوفناک ، دل ہلا دینے والا ، چیخیں ، غل ۔ بھاگ دوڑ ــ اندھیرا ــ اندھیرا ــ ، پورے چھبیس سال کی کمائی لٹ گئی ۔ ماں باپ کا جوان سہارا ۔ بڑھاپے کی لاٹھی ۔ دشمنوں کے حملے کا نشانہ بن گیا ــ جو ہنستا مسکراتا گھر سے اپنے قدموں چل کر گیا ۔ وہ زندہ واپس نہ آیا ۔ خون میں لہولہان ۔ بم کے پھٹ پڑنے سے سارا جسم جھلسا ہوا ۔ آنکھیں جھلسی ہوئی ۔ خاموش ــ خاموش سا ۔ لوگ اُسے اُٹھا کر اندر لائے تھے ۔

" نہیں ! " ــــــــ یہ یہ کیا ہوا میرے لال کو ــ میرا بچہ " بابا بے ہوش ہو گئے ــ امّی پاگلوں کی طرح چیخنے لگیں ــ

" نہیں ۔ میرے لال ــ میرے شاہد ! تو ۔ تو ہمیں چھوڑ کر نہ جانا میرے بچّے ۔ میرے لال ــ "

بہنیں اور بھائی رو رو کر پاگل ہو رہے ہیں ۔ بھیا ! بھیا ۔ یہ کیا ہو گیا گھر ماتم کدہ بن گیا ۔ محلّے بھر کے لوگ جمع ہیں ۔ قیامت کا منظر ہے ۔ جوان بیٹے کی لاش سامنے رکھی ہے ۔

لوگوں نے بتایا کہ کچھ نوجوان اپنے محلے کی ماؤں بہنوں کی حفاظت کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اور شاہد کو بھی اس سلسلے میں صلاح مشورے کے لیے بلایا تھا۔ سب مل کر ابھی غور و خوض کر رہے تھے کہ اچانک سامنے سے ایک بم آکر گرا ــــ دو چار اور لڑکے بھی زخمی ہو گئے لیکن شاہد چونکہ اُن کا نشانہ تھا زیادہ ہی جھلس گیا۔ بے نور آنکھوں میں تمام خواب سو گئے۔ ہونٹوں پر حسرت بھری مسکراہٹ دم توڑ گئی۔ عین بہاروں کے موسم میں برقِ ستمگر نے آشیاں جلا ڈالا۔ سوکھی پیاسی دھرتی پر بادل نہیں برسے۔ بجلی کوندگئی اور ماں کا سینہ پھٹ گیا ــــ لہولہان ہو گیا۔ کون ہے جو ایک دکھیاری ماں کو تسلّی دے ــــ جس کا جوان بیٹا بربریت اور دہشت پسندی کا نشانہ بن گیا۔ کون ہے جو اس بوڑھے باپ کو سہارا دے جس کی زندگی بھر کی کمائی لٹ گئی۔ جس کی لاٹھی ٹوٹ گئی۔ اب بہن کی مانگ میں افشاں کون بھرے گا؟ اس کی ڈولی کون اٹھائے گا؟ ننھے بھائی کا ہاتھ کون تھامے گا ــــ ؟!

تھکی ہاری ماں سے اب یہ کون کہے گا کہ ماں تم اب نوکری چھوڑ دو۔ میں تمہارا علاج کرواؤں گا۔ ماں! تمہیں آرام سے رکھوں گا"

امّی بڑبڑانے لگیں "نہیں نہیں! میرا لال زندہ ہے۔ اُسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُسے تو کل ڈیوٹی پر جانا ہے۔ وہ شہر وائنز ر بن گیا ہے نا۔ میرا چاند" وہ پھر بے ہوش ہو گئیں ــــ بابا کو غش پہ غش آ رہے تھے۔

پولیس آئی ــ اور اس کی لاش لے گئی۔ کسے اتنا ہوش تھا کہ بیٹے کو جی بھر کر دیکھ لیتے ــ بیٹے کا جلوس بھی تو نہ دیکھ سکے ــــ

دوسرے دن پوسٹ مارٹم کے بعد پولس کے پہرے کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے لاش گھر لائی گئی ــــ پتھر کے کلیجے پانی پانی ہو گئے ــــ وہ ہر دل عزیز یاروں کا یار ــــ آخری سفر پر جا رہا تھا۔ آگ اور نفرت کی ہولی میں اس کا لہو بوند بوند کر کے اچھالا جا چکا تھا۔ اس کی جوانی اور حسن ــ اس کے خواب ــ ماں باپ کی تمنّائیں ــــ بہنوں کی آرزوئیں سبھی کچھ نفرتوں کے الاؤ میں بھسم ہو چکے تھے۔ شاہد کا بھرا پُرا گھر خون کی اس ہولی میں جلا تھا ــــ اس کا گناہ کیا تھا؟

سب کی ڈری سہمی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا؛

کیوں؛ ــــــ

کیوں، ــــــ

کوئی بتائے ــــــ کہ یہ نفرتوں کا کھیل کب تک جاری رہے گا۔

کوئی بتائے کہ ــــــ ایسے کئی شاہدوں کے گھر۔ کب تک جلائے جائیں گے!!

ــــــ اور کیوں ؟ !

OO

لال ساڑی

"شادو !۔"

"ہوں ۔"

"تو نے سنا بابا کیا بولتے تھے"؟

"نہیں ۔"

"یہ کہ محلّے والے مجھے آوارہ سمجھتے ہیں!"

"محلّے والے کہتے ہیں نا، بابو تو نہیں کہتے!" شادو کی آواز میں بھولا پن تھا۔

"دونوں باتیں ایک ہیں شادو! کیا تو بھی — تو بھی مجھے ایسا سمجھتی ہے؟"

گُل خاں کی آواز یہ پوچھتے پوچھتے بھرّا گئی۔ شادو نے بڑی بڑی آنکھوں سے اسے ایک لمحہ دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تھی اور ہونٹ کپکپا اُٹھے تھے۔

"سچ شادو! کیا تو مجھے بُرا نہیں سمجھتی؟ اللہ قسم!؟—" گل خاں کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔

"سچ گل —! اللہ قسم۔"

"بس شادو۔ میرے لیے یہی کافی ہے، اب اتنا اور کہہ دے، تیرے دل میں میرا کچھ خیال بھی ہے کہ نہیں۔"

شادو کی معصوم آنکھوں میں شرم کی لالی جھلملانے لگی۔ چہرہ عرق ریز ہو گیا، سر جھک گیا—

" بول شادو ! یہ جو تو ہر روز بابا کی روٹی کے ساتھ میری روٹی بھی رکھے راہ دیکھتی ہے۔
— جھکی جھکی نظروں سے میری طرف شرما کر چپ چاپ دیکھا کرتی ہے۔ یہ سب کیا ہے ؟!
یں..... میں تو تجھے دل سے چاہتا ہوں۔ صرف تجھے ایک نظر دیکھنے کے لیے بابا کی ریڑھی دھکیل
کرلاتا ہوں — کیا تو بھی — تو بھی مجھے چاہتی ہے۔ ؟ "

شادو مُنہ چھپا کر اندر بھاگ گئی۔

اور گل چمکتی آنکھوں سے اُسے دیکھ کر ہنس دیا۔

" گل خاں — میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ کوئی کام کر۔ کمائی والا بن — " بوڑھا بابا روٹی
کا نوالہ توڑتے ہوئے بولا۔

" کیا کام کروں بابا — کوئی کام دے تب نا — !" وہ نوالہ اٹھا نہ سکا۔

" ہاتھ پیر سلامت ہیں، تو کوئی لنگڑا لولا تو ہے نہیں — محنت مزدوری کر ! "

" پہلے وہ بھی کی تھی نا ! میں جھوٹ اور دغابازی سہہ نہیں سکتا بابا۔ اس لیے مالک نے کام سے
نکال دیا کہ میں سچ بولتا ہوں۔" گل کے حلق میں پھندا سا پڑ گیا۔ اس کا چہرہ اُتر گیا — " بچپن میں
ماں باپ نہ مرتے — تو۔ تو میں بے سہارا نہ ہوتا — پڑھا لکھا بھی نہیں۔ پیسہ پاس نہیں۔
کیا دھندا کروں ؟

شادو کوٹھری کے دروازے سے لگی کھڑی اپنے پلو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

" تیری روٹی مجھے بھاری نہیں بیٹا — مگر — مگر کیا کروں، گلی محلّے والے طعن کرتے ہیں کہ
تو۔ تو میرا کون ہے ؟! — " بوڑھا اٹک اٹک کر دل کی بات اُگل بیٹھا — گل کھانا چھوڑ
کر اُٹھ گیا۔

شادو کا بوڑھا بابا دن بھر گلی گلی گھوم کر پھل بیچا کرتا تھا۔ یہی اس کا دھندا تھا اور گل خاں

بوڑھے بابا کے ساتھ رہتا اور اس کی ریڑھی دھکیل کر لاتا۔ لے جاتا اور بابا کے ساتھ پھل بھی بیچ لیتا۔ مگر اس کا اپنا کوئی کام دھندہ نہ تھا۔ وہ خود بے کار ہی رہتا۔ کبھی کبھی کہیں مزدوری کر لیتا تو کچھ روپے بابا کو لا کر دے دیتا، مگر بابا کو اس کی کاہلی اور بیکاری اچھی نہ لگتی تھی، وہ چاہتا تھا کہ گل کسی کام سے لگ جائے، کسی قابل بن جائے۔ تو کسی دن اپنی شادو کے ہاتھ پیلے کر دے۔ بابا کو کتنا ارمان تھا شادو کے بیاہ کا۔ کوئی اور لڑکا اس کی نظر میں نہیں تھا۔ سب ایسے ویسے چور، اُچکے، شرابی اور جواری لگتے۔ بس گل خاں ہی اس کی نظر میں جچتا تھا۔ خوبصورت دراز قامت، میٹھے میٹھے بول بولنے والا۔ کھری کھری سنانے والا ــــ لیکن محلے والے گل کے دشمن تھے۔ وہ کبھی ان کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ شراب پیتا نہ جوا کھیلتا، نہ ڈاکہ ڈالتا۔ انھیں گل کی یہ پارسائی ذرا نہ بھاتی۔ وہ اسی لیے اس کے پیچھے پڑ گئے تھے کہ کسی طرح بوڑھا اس کے خلاف ہو جائے اور گھر میں بیٹھی ہوئی خوب صورت شادو پر ان میں سے کسی کا قبضہ ہو جائے۔ گل کے ہوتے کسی کی مجال نہ تھی کہ ادھر جھانک سکے۔

"شادو بیٹی! آج میلے میں چلے گی کیا؟" بابا بیڑی سلگاتے ہوئے بولا۔

"نہیں بابا! کس کے ساتھ جاؤں؟" وہ بستر لگا رہی تھی۔

"چلی جا کسی سہیلی کے ساتھ۔"

"سب جا چکی ہوں گی۔ میں جا کر بھی کروں گی کیا ــ؟"

بابا کچھ دیر تک بیٹی کو تکتا رہا۔ دل میں پیار امنڈ پڑا ــــ یہ بن ماں کی بچی ــــ دل میں کتنے ارمان ہوں گے۔ ماں ہوتی تو کہتی۔ ضد کرتی۔ مجھ سے ہمیشہ چھپاتی ہے۔ غریب کو میں نہ چاہوں تو کون چاہے؟ کتنی دکھی ہے میری بچی۔

"بیٹی! تو دکھی نہ ہو۔ گل کے ساتھ تھوڑی دیر گھوم آ ــــ یہ لے، یہ کچھ روپے ہیں، اپنے لیے کوئی چیز لیتی آنا۔"

"بابا! تم کتنے اچھے ہو ــــ" وہ بابا کے سینے سے لگ گئی۔

وہ سر پر آنچل بار بار جما رہی تھی۔ گل کی اوٹ میں ڈر ڈر کر قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کا دل ہولے

ہوئے کانپ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گل کے ساتھ آسمان پر اڑی جا رہی ہو۔ میلے کی رنگین بہاریں گہما گہمی، جھولے۔ لہراتی ہوئی رنگین ساڑیاں۔ جگمگاتے نقلی زیورات، وہ بار بار دکانوں کے سامنے رک رک جاتی۔ " ارے چل نا ...." ایک جگہ تو وہ گرتے گرتے بچی۔

گل نے اسے بانہہ سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ پسینے پسینے ہوگئی۔

" شادو! اپنے لیے کیا لے گی؟" وہ رُک رُک کر پوچھنے لگا۔

" آں؟ ہاں — کیا لوں؟"

وہ ہنس پڑا — اپنے لیے لینا ہے، پوچھ مجھ سے رہی ہے۔ اور شادو! میرے پاس ہے کیا جو تجھے لے دوں۔" وہ مایوس ہوگیا۔

اور شادو کلائیوں میں سُرخ چوڑیاں پہن کر دیکھنے لگی۔ " فکر نہ کر — بابا نے روپے دیے ہیں۔ یہ سنبھال۔" شادو نے بٹوا پکڑا دیا — دونوں کی آنکھیں ملیں، جھجکیں، شرمائیں — ان نظروں میں اپنائیت کے سوا کچھ نہ تھا۔

شادو چوڑیاں، نقلی موتیوں کا ہار اور کئی ساری چیزیں خرید چکی تھی۔ اُس نے دو رومال بھی لیے تھے — ایک سفید، ایک لال — یہ رومال اُس نے گل کے لیے خریدے تھے۔ ایک دوکان پر وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔

" اب کیا لینا ہے۔ چل اب دیر ہو رہی ہے۔"

" وہ دیکھی تو نے لال ساڑی گوٹے والی — کیسے جھم جھم کر رہی ہے۔" وہ حسرت بھری نظروں سے لال ساڑی کو تکنے لگی، جو دُکان میں ایک گڑیا پہنے گھونگھٹ کاڑھے کھڑی تھی۔ گل نے قیمت پوچھی تو دکان دار نے پچاس روپے بتائے۔

" باپ رے! پچاس روپے —؟!" شادو دھیرے سے بولی۔

" مایوس نہ ہو شادو۔ کبھی کسی دن ایسی ساڑی تجھے ضرور پہناؤں گا۔"

" گل!" وہ جھینپی —

" ہاں شادو!" وہ مسکرانے لگا — آنکھوں میں سپنوں کی دنیا جھوم اُٹھی۔

" ذلیل، کمینے! کیا اسی لیے میں نے اپنی بیٹی کو تیرے ساتھ بھیجا تھا کہ تو اُسے لے کر میلے میں ناچے گائے۔؟"

" یہ جھوٹ ہے بابا! کس نے بتایا ہے تمھیں؟" وہ دنگ رہ گیا۔

" سارے محلے والوں نے دیکھا ہے گل! تو کس کس کا منہ بند کرے گا۔ میں نے بے سہارا جان کر تجھے سہارا دیا۔ اپنا بیٹا سمجھا اور آج تو نے میری عزت اچھالی ہے۔" بوڑھا غصّے سے ہانپ رہا تھا۔

" نہیں نہیں بابا۔۔۔ یہ جھوٹ ہے۔ ان لوگوں نے دشمنی سے یہ بدنامی اٹھائی ہے۔ اللہ قسم۔۔۔ شادو سے پوچھ لو۔۔۔"

" شادو کی مجال نہیں کہ منہ پر جواب دے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کر بیٹھوں تو۔۔۔ یہاں سے چلا جا۔۔۔ چلا جا۔۔۔ اپنی صورت پھر نہ دکھانا۔ تو آوارہ ہے، کمینہ ہے۔"

" بابا مجھے آوارہ نہ کہو۔ میں بھی شریف ماں باپ کی اولاد ہوں، غریب ہوں تو کیا؟ عزت مجھے بھی پیاری ہے۔" گل کو طیش آ گیا۔

" بڑا آیا عزت والا بن کر۔۔۔ جا جا!" بابا اپنی لاٹھی اُٹھا کر آگے بڑھا۔ وہ بھڑک اٹھا تھا۔ شادو دوڑ کر آ گئی۔

" بابا، میرے اچھے بابا! گل چلا جائے گا۔ اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ بابا۔ لوگوں نے تمھیں بہکا دیا ہے بابا۔" وہ رونے لگی۔

" تیری یہ مجال۔" بوڑھے نے بیٹی پر لاٹھی اٹھا دی۔ گل بیچ میں آ گیا۔

" چھوڑ دو، چھوڑ دو۔ یہ لاٹھی۔۔۔ تم غصّے میں پاگل ہو رہے ہو۔"

" نہیں۔۔۔!!۔۔۔ اور شادو دُور جا گری۔ گل نے اُسے دھکیل دیا۔ اور اُس کی چیخ نکل گئی۔

گل کے سر پر چوٹ آ گئی تھی۔ سارا چہرہ خون میں لت پت ہو رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ حسرت بھری نظروں سے شادو کو دیکھا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔۔۔

" یاد رکھنا بابا! پچھتاؤ گے کسی دن۔ یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں — میں بھی بدلہ لوں گا — بدلہ لوں گا۔"

" نہیں نہیں گل —" اور دور تک شادو کی سہمی سہمی سسکیاں اُسے سنائی دیتی رہیں۔

زمانہ تیز رفتاری سے بہت آگے بڑھ آیا ہے۔ بوڑھا بابا اپنی زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہا ہے، اور شادو وہ الھڑ سی شادو نہیں رہی۔ اس نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اس کے چہرے کی رونق جانے کہاں گم ہو گئی۔ آنکھوں کے ستارے بجھے بجھے سے ہیں اور اس کی سیاہ زلفوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے ہیں۔ وہ وقت سے پہلے ہی جوانی کو پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

گل کے جانے کے بعد محلّے کے دو چار غنڈوں نے چاہا کہ شادو ان کے ساتھ بیاہ دی جائے مگر بابا راضی نہ ہو سکا۔ آج شادو کے لیے ایک بھی رشتہ نہ تھا۔ بوڑھا اُٹھتے بیٹھتے بیٹی کو دیکھتا رہتا ہے، کڑھتا رہتا ہے۔"

" میری بھولی بھالی بچّی! اب تیرے لیے کوئی بر نہ آئے گا، کوئی تجھے بیاہ کر اپنے گھر نہ لے جائے گا، تیری ڈولی کبھی نہ اُٹھے گی میری بچّی! سب کے سب کمینے ہیں۔ میں کب تک اپنی سانس روکے رکھوں گا۔ ایک ہچکی کے ساتھ یہ ڈوری ٹوٹ جائے گی اور تو بے سہارا ہو جائے گی —"

— وہ رونے لگتا ہے۔ پچھتاوا اُسے سانپ کی طرح ڈسنے لگتا ہے۔

اور شادو میلے میں دیکھی ہوئی لال گوٹے والی ساڑی کا سپنا دیکھتے دیکھتے اب مایوس ہو چکی تھی۔

" شادو!" ایک سرگوشی —

" کون ؟"

" پہچانا نہیں —"

" کون ہو تم ؟"

" پہچان لو —" کوئی ایک دم اندھیرے سے اُجالے میں آگیا۔

" ہائے تم — تم گل تو نہیں — گل — یہ تم ہو ؟!"

"ہاں شادو! تمہارا گل ہی تو ہوں۔"

"اوہ گل ۔۔ تم مجھے بھولے تو نہیں نا ؟! میں تو سمجھتی تھی تم اب کبھی نہ آؤ گے۔" وہ ہنستے ہنستے رو پڑی۔ اُس کے نحیف چہرے پر بہاروں کی رنگینی اُتر آئی۔

میری شادو! کہیں زندگی بھی زندگی کو بھول سکتی ہے۔ میں جیسا رہا اور جہاں بھی رہا تمہیں یاد کرتا رہا ۔۔۔ یہ دیکھو۔" اُس نے لال گوٹے والی ساڑی شادو کے ہاتھوں پر رکھ دی۔

"اوہ! لال ساڑی ۔۔۔ کتنی پیاری ہے۔ ویسی ہی جیسی ہم نے میلے میں دیکھی تھی۔ اتنی قیمتی ساڑی ؟!!"

"چوری کی نہیں، میری کمائی کی ہے۔ میں یہاں سے نکل کر گاؤں گاؤں بھٹکتا رہا۔ کہیں مزدوری کی پیٹ بھرا ۔۔۔ یوں ہی برسوں بیت گئے۔ آخر میں ایک دوکان میں نوکر ہو گیا۔ مالک مجھ سے بہت خوش تھا۔ میں دوکان میں روز اجنبی لڑکیوں کو لال پیلی ساڑیوں کے بنڈل تھماتے ہوئے سوچتا کہ کاش ایسی ہی ایک ساڑی اپنی شادو کو پہنا سکوں۔ دل پر آرہ سا چل جاتا شادو! اور آج میرے پاس نوکری ہے، کچھ روپیہ بھی ہے، اور ایک چھوٹا سا مٹی کا مکان بھی ۔۔۔ ہاں شادو! یہ مکان تیرا ہے اس کے دروازے تیری راہ دیکھ رہے ہیں۔ میں بابا سے بات کروں گا ۔۔۔ تجھے مانگ لوں گا۔"

"گل ۔۔! " شادو کی آواز خوشیوں کی سرگم میں کانپ اٹھی تھی۔ اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ ۔۔۔ مگر گل ۔۔ بابا سے یہ سب کچھ نہ کہو ۔۔۔ وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔ تم چلے جاؤ ۔۔" وہ سہم گئی۔ گل کی پیشانی پر ایک زخم کا نشان باقی تھا۔

"نہیں شادو! تو میری فکر نہ کر۔ میری محبت بزدل نہیں۔ ہاں ذرا اوڑھ کر تو دکھا۔ کیسی لگتی ہے میری دُلہن ۔۔۔" گل نے زرتار آنچل شادو کے سر پر ڈال دیا۔ گوٹے کی طرح شادو کا چہرہ دمک اُٹھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔۔۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ دھک دھک ۔۔۔ دھک دھک۔۔۔۔

"دُلہن ۔۔۔ میری دُلہن ۔۔۔ کتنی خوب صورت ہو شادو تُم ۔۔۔ میں بابا سے کہہ کر تمہیں بیاہ لے جاؤں گا۔"

شہنائیوں کا شور گونج اُٹھا، دھڑکنوں کا زیر و بم، برسوں کا دیکھا ہوا سپنا تعبیر بنا مسکرا

رہا تھا۔ لال ساڑی ــ سہاگ کا جوڑا..... میری محبت آج سہاگ کا جوڑا پہن چکی ــ اور یہ گل ــ میرا دولھا ــ میرا شاہزادہ ــ!

اور شادو لڑکھڑا کر گل کے قدموں میں گر پڑی۔

" شادو ــ شادو! کیا ہوگیا تجھے ــ بول بول نا ــ" گل خاں نے گھبرا کر اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ خوشیوں کے بے پناہ ہجوم کو ایک کمزور ٹوٹا ہوا دل سہار نہ سکا، اور شادو لال ساڑی اوڑھے دُلہن بنی گہری نیند سو گئی ـ

شادو ــــ!" گل کی چیخ بڑی ہسٹریائی تھی!!!

OO

چھپکلی

وہ مصور تھا.... حسن کا پرستار، پتی پتی، بوٹے بوٹے.... غنچے غنچے میں حسن تلاش کرنے والا مصور،.... نیلے آسمان پر بادلوں کی اوٹ میں آنکھ مچولی کھیلتے چاند،.... بے کراں سمندر کی وسعتوں پر ڈولتی کشتیاں،.... سربلند سرمئی کوہساروں پر جمی برف.... غرض کہ وہ ہر چیز میں خوبصورتی ڈھونڈتا ــــ پہروں تلک خوبصورت مناظر میں کھویا رہتا۔ پھر جو برش اٹھاتا تو اپنے ہاتھ کی جنبش سے کینوس پر ان حسین نظاروں کو زندگی بخش دیتا۔

یہی اس کا مشغلہ تھا، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ حسن کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ آج یہاں تو کل وہاں۔

اُس روز بھی سرِ شام وہ سرو کے جھنڈ کے پاس کینوس پر بل کھاتی ندی کی تصویر اُبھار رہا تھا کہ سامنے سے وہ آگئی، ایک بُت کی طرح خاموش، گہری گہری نظروں سے اسے تکنے لگی۔

وہ بھی سحر زدہ سا اس مکمل حُسن کو تکتا رہا۔ خوبصورتی کی اک زندہ تصویر اس کے سامنے تھی: کشادہ پیشانی، چمکیلی نیلگوں آنکھیں،.... ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ اور گہرے سیاہ بالوں کی لمبی لمبی چوٹیاں گلے میں جھولتی ہوئی،....

وہ کچھ دیر کے لیے کھو گیا۔ پھر چونکا،

"آپ ۔ آپ کون ہیں؟"

"میں کلثوم ہوں.... اور آپ ؟!" تصویر بول اُٹھی،

"میرا نام بھی مصوّر ہے اور کام بھی"۔

"بڑی خوبصورت تصویر ہے۔!!" وہ پاس آکر دیکھنے لگی تھی،

"لیکن آپ سے کچھ کم"۔ وہ مسکرا رہا تھا،

"جی ؟!" وہ تعجب سے پیچھے مڑی، پھر دھیرے سے مسکرا دی۔

"کہئے تو... آپ کی تصویر بنا دوں؟!"

"میری ؟۔ اوئی اللہ"۔

"سچ کہتا ہوں۔ بڑی حسین تصویر بنے گی"۔

"کہاں سے آئے ہو؟!" وہ پوچھ بیٹھی۔

آج ہی شہر سے آیا ہوں۔ تصویریں بناتا ہوں، یوں تو ہمیشہ بے جان نظاروں کی تصویر کشی کی ہے لیکن آج۔ آج جی چاہتا ہے کہ اِس زندہ تصویر کی تصویر بناؤں"۔ وہ بڑا صاف گو تھا،

"بابا مجھے مار نہ ڈالیں گے۔ آپ ان سے پوچھ لیجیے"۔ پھر اپنی تصویر بنوانے کی دھن میں کلثوم مصوّر کو اپنے گھر لے آئی۔ اس کا بوڑھا بابا مصوّر سے مل کر بڑا خوش ہوا۔ مصوّر اپنی خوش مزاجی سے اُسے مسحور کر چکا تھا۔ بابا نے اسے اپنا مہمان بنا لیا۔ پھر اُس نے بابا سے اجازت بھی مانگ لی کہ اس بار شہر میں نمائش ہو رہی ہے۔ وہ کلثوم کی تصویر بنا کر پیش کرے گا تو اس کے مستقبل میں ضرور تبدیلی آجائے گی، وہ مشہور ہو جائے گا۔ بابا ڈرتا رہا۔ گاؤں والے بدنام کریں گے۔ لیکن مصوّر کی التجا نے اُسے منا لیا اور کلثوم نے بھی بابا سے کہا تھا۔

"بابا۔ دیکھو نا آج تک میری کوئی تصویر نہیں آتاری ہے۔ ہاں کہہ دو بابا"! اور اس نے اجازت دے دی تھی۔

اور مصوّر نے کینوس پر کلثوم کی تصویر بنانی شروع کر دی، ہر روز ایک گھنٹہ اُسے مصوّر کے سامنے بیٹھنا پڑتا، سر پر ڈھلکتا آنچل، لبوں پر ملکوتی تبسّم اور نگاہوں میں حجاب اور شوخی کی آمیزش۔ حُسن و شباب کی مورت کاغذی پیرہن پہنتی رہی۔

کلثوم کاغذ پر اپنی شبیہہ دیکھ کر جھوم اٹھتی۔

"مصوّر! تمہارے ہاتھوں میں جادو ہے کیا؟!"

"نہیں — تمہاری ان ہرنی جیسی آنکھوں میں جادو ہے!"

اور وہ شرما کر اندر بھاگ جاتی ۔

گاؤں بھر میں مصوّر کی آمد مشکوک بن گئی، گاؤں کے سیدھے سادے لوگ ایک شہری بابو کو اچھی نظروں سے نہ دیکھ سکے، انھیں ڈر تھا کہ وہ یہاں کی پاک اور پرسکون فضا میں ہلچل مچانے آیا ہے اور ضرور کسی دن کلثوم کو بدنام کر کے چلا جائے گا ۔ سب اس کے خلاف تھے ۔ راستے میں اس کا گزر ہوتا تو وہ منہ پھیر لیتے ۔

مصوّر نے ان کی بے رخی کو پہچان لیا تھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ بس اپنے کام میں لگا رہا۔ کلثوم کی بھولی بھالی شبیہہ اس کے دل میں گھر کر چلی تھی ۔ باپ بیٹی کی محبت اور خلوص، ان کی خدمت نے مصوّر کا دل موہ لیا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں بسے ہوئے اس چھوٹے سے خوبصورت گاؤں کی خوبصورت لڑکی اس کی زندگی میں دھیرے سے آگئی تھی، اسے امید تھی کہ جب وہ اس حسن کے شاہکار کو نمائش میں پیش کرے گا۔ تو شہر بھر میں تہلکہ مچ جائے گا ۔ اور ضرور یہ تصویر انعام کی مستحق ہوگی ۔ اسی سے اس کے روشن مستقبل کی تعمیر ہوگی۔

"مصوّر! ابھی کتنے دن اور لگ جائیں گے؟!" وہ شاید اکتا کر پوچھتی

"بس اب کچھ دن اور۔ تھک گئیں کیا؟!" — وہ برش روک کر کہتا

"نہیں تو۔" وہ مسکرانے لگتی

"کلثوم! سچ پوچھو تو جی چاہتا ہے تم یونہی مجسم بنی بیٹھی رہو اور میں تمام عمر یونہی تمہاری تصویر میں رنگ بھرتا رہوں۔"

وہ شرم سے گلنار ہو جاتی اور سر جھکا لیتی

"کلثوم! تم پہلی لڑکی ہو جو میرے دل میں سمائی ہے میں تمہیں اپنی زندگی بنا لینا چاہتا ہوں۔" وہ جذبات سے پُر آواز میں کہتا اور کلثوم کی آنکھیں بھر آتیں۔

اس شام اس کی تصویر مکمل ہوگئی تھی، مصوّر نے ہلکے اور شوخ رنگوں کے امتزاج سے اتنی حسین اور مکمل تصویر بنائی تھی کہ ایسا لگتا یہ ابھی بول پڑے گی، ساری تصویر میں خصوصاً آنکھوں کو بہت ابھارا گیا تھا پوری تصویر پر دو گہری آنکھیں چھائی ہوئی تھیں ۔ اک والہانہ انداز میں مسکراتی ہوئی

دو حسین آنکھیں۔۔۔

کلثوم خوشی سے مضطرب ہو رہی تھی اور بابا نے بھی مصوّر کے آرٹ کو بہت سراہا تھا۔ مصوّر کل شہر جانے کی تیاری میں تھا اُس نے وعدہ کیا تھا کہ نمائش ختم ہوتے ہی وہ گاؤں آئے گا۔

لیکن تب ہی گاؤں والوں کا ہجوم بابا کے گھر کے سامنے جمع ہو گیا، وہ سب مصوّر کے خلاف چیخ رہے تھے گالیاں دے رہے تھے اور لاٹھیاں اٹھائے اُسے مار ڈالنے کی دھمکی دے رہے تھے۔

"باہر نکالو تمھارے اس مصوّر کو۔۔ ہم جان سے مار ڈالیں گے۔"

"یہ بدمعاش ہے، گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیوں کو لوٹنے آیا ہے۔"

"تمھاری بیٹی اس سے محبت کرتی ہے اور یہ اسے چھوڑ کر بھاگ جائے گا پھر تمھاری بیٹی کو کوئی نہیں بیاہے گا۔"

بابا باہر آکر انھیں سمجھانے لگا لیکن ان کا جوش کم نہ ہوا وہ برابر چیختے رہے۔ تب مصوّر آگے بڑھا۔ کلثوم اُسے روکنے لگی،

"نہ جاؤ مصوّر! وہ تمھیں مار ڈالیں گے۔"

"نہیں ۔۔ تم مجھے جانے دو۔" اور وہ کلثوم کو پرے دھکیل کر باہر آگیا ۔۔" مارو ۔۔ پکڑو۔"

"نہیں! ۔۔ پہلے میری بات سُن لو ۔۔ پھر مجھے مار ڈالنا"

پھر سب اک لمحے کو چپ ہو گئے۔

"میں کلثوم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟ ۔۔ تم شادی کرو گے کلثوم سے؟!"

"ہاں ۔۔ اور اسی وقت ۔ پھر میں اُسے دلھن بنا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

اور لاٹھیاں جھک گئیں۔ گاؤں والوں نے خوشی میں مصوّر کو کندھوں پر اٹھا لیا۔

اسی رات تاروں کی چھاؤں تلے، شہنائیوں کی گونج میں کلثوم دلھن بن گئی، ۔۔۔ اور صبح سویرے مصوّر اپنی حسین دلھن اور اپنے انمول شاہکار کو لے کر گاؤں سے رخصت ہو گیا۔

نمائش میں مصوّر کی تصویر "گاؤں کی گوری" نے پہلا اور خصوصی انعام جیتا اس تصویر کی پاکیزگی

اور معصومیت اپنی جگہ بے پناہ تعریف کی مستحق تھی، اور زندگی میں عیش و عشرت کی راہیں کھل گئیں.....
پھر مصوّر کی مانگ بڑھنے لگی، اس کی تصویروں کی قیمت، ہزاروں تک جا پہنچی، آرٹ کے قدردان لوگوں نے مصوّر کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کلثوم نے مصوّر کو نیا اور سنہرا مستقبل دیا تھا، ان کی زندگی میں خوشیوں کا رنگین دور آ گیا تھا اور دونوں محبت میں سرشار اپنے نئے خوبصورت بنگلے میں آباد ہو گئے تھے۔

اب مصوّر نے اپنا ایک الگ سٹوڈیو بھی بنا لیا تھا، جہاں کلثوم کے مختلف پوز جلوہ گر تھے ــــ وہ شب و روز کلثوم کی ہر ایک زاویے سے تصویریں بنایا کرتا، انھیں نوکِ قلم سے سنوارتا نکھارتا، اکثر کلثوم بیٹھے بیٹھے تھک جاتی۔

"اب ختم بھی کرو نا۔ کچھ دیر آرام کر لو" وہ انگڑائی لیتے ہوئے کہتی

"نہیں میری جان! مجھے تو تمھاری قربت میں بہت راحت ملتی ہے۔ کہا تھا نا کہ تمام عمر تمھیں یونہی بٹھا کر تصویریں بنایا کروں گا" وہ مسکرا دیتا اور کلثوم شرما کر رہ جاتی!!

دوسری سالانہ نمائش میں بھی کلثوم کی تصویر دلھن نے انعام جیتا۔ غیر ملکوں میں بھی مصوّر کے آرٹ کے قدردان پیدا ہو گئے،..... اس کی تصویریں غیر ملکی نمائشوں میں بھی جانے لگیں.....

یوں پورے چار سال گزر گئے

اور پانچویں سال کلثوم ایک ننھی سی گڑیا کی ماں بن گئی، بچی بالکل کلثوم کا روپ تھی وہی حُسن وہی آنکھیں، ـــ مصوّر ہنس کر کہتا؛

"یہ تو ننھی کلثوم ہے!! میں اس کی تصویر بناؤں گا اگلی نمائش میں"

پھر اُس نے ننھی گڑیا اور کلثوم کی تصویر بنائی،..... گود میں ننھی بچی کو اٹھائے کلثوم ماں کے روپ میں مسکرا رہی تھی، آنکھوں میں ممتا جھلکتی ہوئی اور چہرے پر ایک تقدّس بھرا نُور۔ اس تصویر کا عنوان تھا ممتا۔

مصوّر نے شب و روز اس تصویر کے لیے نذر کیے تھے اُسے یقین تھا کہ یہ تصویر بھی اس کے لیے کامیابی لائے گی؛

لیکن عوام نے حُسن کا یہ انداز پسند نہیں کیا، شوخ نظروں کو حسن اور شباب کی رعنائی پسند تھی نہ کہ جوانی کا ڈھلتا ہوا روپ ـــ اور مصوّر کا یہ شاہکار دوسرے نمبر پر آ گیا۔ ایک ابھرتے

ہوئے جواں سال مصوّر کی عریانیت سے بھرپور تصویر نے پہلا مقام لے لیا تھا۔ جو شائقین کو بے حد بے باکی سے دعوتِ نظارہ دے رہی تھی!!

اور مصوّر کا دل بری طرح ٹوٹ کر رہ گیا، وہ بیحد کبیدہ خاطر اور دل برداشتہ ہو گیا تھا، اور کلثوم بھی بہت غمگین تھی،

مہینوں تک اس نے ہاتھ میں برش نہیں اٹھایا، اس نے سٹوڈیو بھی بند کر دیا تھا، اس کی شہرت گھٹنے لگی تھی، اس کے کئی شاہکار گرد میں اٹے پڑے تھے کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ اس نے کلثوم کی جوانی کے جو کئی روپ دیواروں پر آویزاں کیے تھے وہ سب اتار کر اسٹوڈیو میں بند کر دیے تھے، ـــ کلثوم اس تبدیلی پر حیران اور پریشان تھی، وہ محسوس کرنے لگی کہ اب مصوّر اس سے بے توجہی برتنے لگا ہے۔ پہلی سی والہانہ محبت نہ رہی۔ وہ خاموش خاموش اور کھویا کھویا سا رہتا نہ کلثوم سے ہنستا بولتا نہ منّی کو پیار کرتا،

کلثوم نے آخر پوچھ لیا،

"کیا بات ہے آپ اتنے خاموش ہو گئے ہیں۔"

"تو کیا کروں ـــ میرے نام پر تو دھبّہ آ ہی گیا" وہ جھنجلا کر بولا۔

"اس میں میرا یا اس معصوم کا کیا دوش! یہ تو ہماری محبت کی نشانی ہے"

"اور اسی نشانی نے میری شہرت گھٹا دی ہے ـــ جاؤ مجھے تنگ نہ کرو"

یوں مصوّر اس سے بیزار رہنے لگا، پھر وہ سارا سارا دن جانے کہاں گزار آتا۔

کلثوم اپنی گڑیا کو سینے سے لگائے کڑھتی رہی، غم کی آگ میں جلتی رہی، اس کی زندگی کا سفینہ عین طوفان میں جا پھنسا تھا، پھنکارتی موجیں اور چکراتا ہوا سفینہ، اب ڈوبا کہ اب ڈوبا۔ وہ آئینہ کے سامنے آجاتی، وہی پرکشش آنکھیں وہی تاباں پیشانی اور گلگوں رخسار، ـــ اور اس کی آنکھوں میں ماضی ابھر آتا، ـــ اس کا بت بنے گھنٹوں بیٹھے رہنا اور مصوّر کا لکیریں کھینچتے ہوئے ہاتھ اور سراہتی ہوئی آنکھیں، ـــ اس کے دل سے ایک آہ نکل جاتی، ـ اُسے اپنا بابا یاد آنے لگتا جو پچھلے سال اُسے تنہا چھوڑ کر دنیا سے جا چکا تھا وہ اپنا تڑپتا دل کسے دکھاتی؟ کہاں جاتی؟!

اس کا محبوب مصوّر اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

- -

پھر نمائش قریب آگئی، اُس کے دل میں ایک امید جاگی،

"مصوّر! اس بار تم صرف میری تصویر بناؤ۔ کوئی شوخ انداز میں تاکہ تمہاری مقبولیت پھر چمک اُٹھے"۔ وہ بڑی آس سے بولی

نہیں۔ اب کبھی تمھاری تصویر نہیں بناؤں گا، کبھی نہیں، وہ آخری تصویر تھی" وہ چیخ اٹھا۔ چہرہ سُرخ انگارہ بن گیا،

"مصوّر!" کلثوم کی آواز کانپ اٹھی

"اب تم میں کیا رہا؟— نہ وہ کشش نہ وہ شباب۔ تم اب ماں بن گئی ہو— تمھارا حسن ڈھل گیا ہے۔ تمھارا یہ بسورتا ہوا چہرہ نمائش میں رکھوں؟!" وہ پھٹ پڑا اور اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا اور کلثوم منہ چھپائے روتی رہ گئی۔

پھر اُس نے سنا کہ نمائش میں مصوّر نے پہلا انعام جیت لیا، اس کی پڑوسن شیلا نے بتایا تو وہ خوشی سے پاگل سی ہو گئی، "دیکھوں تو کس کی تصویر ہے؟!" اور وہ برقع پہن کر شیلا کے ساتھ نمائش پہنچی۔ بھیڑ میں چھپتی چھپاتی وہ وہاں تک پہنچ گئی۔ اور پر شوق نظروں سے دیکھا۔ کہ ایک خوبصورت نوخیز حسینہ عریاں لباس میں مسکرا رہی تھی— اس کا دل بیٹھنے لگا تبھی اس کی نظر اپنے مصوّر پر جا پڑی، جس کے پہلو میں وہی تصویر والی لڑکی بیحد بے باکی سے ہنس رہی تھی،

"اسے حُسن کی ملکہ چنا گیا ہے، مقابلے میں!!" شیلا نے بتایا

وہ گرتی پڑتی باہر آگئی "تو میرا مصوّر اپنی شہرت کے لیے اتنا ذلیل ہو گیا ہے۔ دولت کے لالچ میں اپنے مقام سے گر گیا ہے۔ ایک بازاری لڑکی کے لیے مجھ سے میری مُنّی سے بھی دور ہو گیا ہے۔ میں جو اس کی محبوبہ تھی، جو اس کی بیوی ہوں"۔ روح فرسا خیالات اُسے پاگل کرنے لگے "میں مرجاؤں گی— میں اس دنیا سے چلی جاؤں گی"۔ وہ دیوانوں کی طرح اٹھی۔ اپنی بچی کو اٹھا لیا اور رات کے سناٹے میں گھر سے نکل پڑی۔ اور ایک ہی بازگشت اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

"اب تم میں کیا رہا نہ حُسن نہ شباب، تمھارا یہ بسورتا چہرہ نمائش میں رکھوں؟

"اب تم میں کیا رہا...؟— کیا رہا؟"

وہ بے تحاشا روتی ہوئی سڑک کے بیچوں بیچ چلی جا رہی تھی۔ کہ ایک تیز روشنی سے آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔۔۔ اور جب ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھی "میں زندہ ہوں۔ میں زندہ ہوں؟"۔۔۔ اور اس کے پہلو میں اس کی گڑیا نہیں تھی۔

"میری بچی۔۔ میری منّی!!"۔۔۔ وہ اپنے زخمی ہاتھ سے ٹٹولنے لگی۔

"تمہاری بچی کار تلے دب کر مر گئی"۔۔ نرس نے بتایا تو وہ چیختی چلاتی باہر دوڑی "منّی۔ منّی۔ تو کہاں چلی گئی۔ مصوّر نے مجھ سے منہ موڑ لیا تھا۔۔۔ تو بھی مجھے چھوڑ گئی۔۔ ہائے۔ میں مری کیوں نہیں۔ میری منّی مر گئی۔۔ میری منّی!!" اس کی دلدوز چیخیں گونجتی رہیں۔

اور کلثوم پاگل ہو گئی۔۔۔ کبھی ہنستی ہے۔ کبھی روتی ہے، لوگوں کے بچّوں کو اٹھانے دوڑتی ہے۔ کبھی کسی چبوترے پر یوں بیٹھ جاتی ہے جیسے اس کی تصویر اتاری جا رہی ہو۔۔ دھیرے سے مسکراتی رہتی ہے۔۔

"مصوّر! اب جلدی سے بنا دو تصویر۔ میں تو تھک گئی ہوں"۔ پھر آپ ہی آپ قہقہے لگاتی ایک سمت کو دوڑ جاتی ہے۔

ابھی ابھی یہ کس کا قہقہہ گونجا؟۔۔۔ ہاں یہ وہی کلثوم ہے۔ پگلی!!!

OO

برف کے پھول

"کیا آج برف گرے گی وکاس؟" وہ نرم ریشمی بستر پر لیٹی دزدیدہ نگاہوں سے کھڑکیوں کے پردے دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ وکاس اپنا گرم ہاتھ اس کے ٹھنڈے ماتھے پر رکھتا ہوا بولا۔

"نہیں ریشم! برف ابھی کہاں ہے۔ تم اطمینان سے سو جاؤ، میں کھڑکیوں کے پردے گرائے دیتا ہوں۔"

"پردے گرانے سے کیا ہوگا... ذہن کی ساری کھڑکیاں تو کھلی رہیں گی نا!" وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ وکاس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ اٹھا...... وہ سخت لہجے میں کہہ بیٹھا۔

"تمہاری یہی سوچیں تمہاری دشمن ہیں۔ ہزار بار کہا کہ بے کار باتیں نہ سوچا کرو، لیکن تم... تم نے کب کسی کی سنی ہے۔؟ ڈاکٹر کہتے ہیں طبیعت خوش رکھوں۔ ایک پل بھی تنہا نہ چھوڑوں، تم جو کہتی ہو وہی کروں۔ اور تمہیں لیے لیے گھومتا پھروں... لیکن ایک تم ہو کہ تمہیں کسی کے ایثار، کسی کے پیار کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں۔ یہ جو میں اپنے کام چھوڑ کر تمہارے دامن سے بندھا بندھا مہینوں سے پھر رہا ہوں... پاگل ہوں نا؟"۔ وہ ایک ہی سانس میں یہ سب کچھ کہہ کر جیسے تھک گیا۔ اُس نے مٹھیاں بھینچ لیں... کنپٹیوں پہ رگیں ابھر آئیں اور چہرہ سرخ انگارہ بن گیا ہے۔

"ہاں وکاس! اسے کسی کے ایثار کا کیا خیال جو جان بوجھ کے بیمار بنی رہتی ہو۔ تم.... تم بھی میرا خیال نہ کرو... چھوڑ دو نا مجھے میرے حال پر۔! کانچ کی گڑیا کی طرح کیوں سنبھالتے پھرتے ہو؟" ریشم کی آواز میں برسوں کی تھکن اتر آئی جیسے چلتے چلتے نڈھال ہوگئی ہو۔ اس کی آنکھیں زرد اور

اداس سے دو دیے لگ رہے ہیں جو اندھیری رات میں ہوا کی زد پر جھلملا اُٹھے ہوں ـــ وکاس کا غصّہ ایک پل کا جھونکا تھا۔ ریشم کی مایوس باتیں وہ کب سہار سکتا؟ فوراً اس پر جھکا اور سارے اس کی بکھری لٹیں سنوار کر بولا ـــ

"ریشم پلیز! فار گاڈ سیک ڈونٹ ہرٹ می ریشم! تم ایسی باتیں کروگی تو میں کل سچ مچ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ کیا تمھیں یہ احساس نہیں کہ تمھاری بیماری سے میں کتنا ٹوٹ چکا ہوں... کتنا بکھر چکا ہوں"

ریشم نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور چپکے سے اپنے سرد لبوں پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ ریشم کی یہی ادا وکاس کو بہت پسند تھی۔ وہ جب بھی اُسے ڈانٹتا تو جیسے اپنی ہار مان کر وہ ایسی حرکت کر بیٹھتی تھی۔ اور وکاس کو اس پر بے اختیار پیار آجاتا۔! اور جب ریشم کو نیند کا غلبہ سا ہوا تو وکاس نے چپکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ لحاف ٹھیک کیا اور ہلکا سبز بیڈ لائٹ جلا کر دریچے کی طرف چلا آیا۔ اور ایک ایک کر کے سارے پردے گراتا گیا۔ حتیٰ کہ سرہانے والے دریچے کے پاس پہنچتے پہنچتے برفباری ہونے لگی۔ اس نے پردہ کھینچا اور ایک کونہ تھام کر باہر دیکھنے لگا۔ سفید دودھیا برف ـ آسمان سے موگرے کے پھولوں کی طرح بے آواز بکھرنے لگی ہے جیسے شام کی دلہن نے آسمان کی تھالی سے سفید سفید پھول اچھال دیے ہوں۔ دور، وادیوں میں.... کہساروں پر ..... مکانوں کی چھتوں اور راستوں پر برف ہی برف ...!! ایک سرد سی لہر اس کے رگ وپے میں دوڑ گئی۔ اسی برف تلے کتنی یادیں دفن ہیں۔ آرزوؤں کے کتنے پیکر۔ سپنوں کے کتنے رنگ اسی برف کی تہوں میں جا سوئے ہیں۔ کبھی نہ جاگنے کے لیے!!

میرے اندر بھی تو سال بھر برفباری ہوتی ہے۔ جسے ریشم کے پیار کی گرمی بھی پگھلا نہ سکی۔ یہ میرا وجود۔ میری روح، برف کا یخ تودہ ہی تو ہے۔!! یہ جو چلتا پھرتا ہنستا بولتا وکاس ہے صرف ریشم کی خاطر زندہ ہے ورنہ وکاس تو کب کا مر چکا، کب کا برف کے تودوں میں دفن ہو چکا۔ اپنی پونم کے ساتھ ـــ اپنے پیار کے ساتھ!! ـــ

وکاس تم آخر کب تک اپنے آپ کو فریب دوگے؟ کب تک ریشم کو فریب کے حسین رنگوں سے بہلاتے رہوگے؟.... وہ اب کچے دھاگے کے سوا اور کچھ نہیں رہ گئی ہے ایک ہی جھٹکے سے جیون کا یہ بندھن توڑ کر چل دی۔ تم کب تک اسے نہیں بتاؤ گے کہ تم نے اسے صرف پونم سمجھ کر

چاہا ہے۔! اور پونم جان کر ہی تو اسے اپنایا اور زندگی کے راستوں پر اسے ساتھ لیے پھرتے ہو۔ وکاس! کیا اب یہ نہیں ہو سکتا کہ جو مر چکا اسے بھول جاؤ۔ جو زندہ ہے اسے جینے دو۔ یہ کیا کہ تم مرے ہوئے کو زندگی دیتے دیتے جینے والے کو مردہ بنا رہے ہو۔ پونم تو مر چکی۔ تمہاری زندگی سے جا چکی۔ ریشم زندہ ہے۔ اسے اپنی زندگی سے جانے نہ دو۔ ورنہ کیا رہ جائے گا تمہارے پاس؟ ایک گہرا اندھیرا۔ ایک طویل خاموشی اور دور دور تک ویران رستے پر پھیلی ہوئی تنہائی۔!!

نہیں۔! نہیں!!۔ اور وکاس نے جھلا کر دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کو جکڑ لیا. جو انگاروں کی طرح تڑخ اٹھی تھیں۔

"ریشم! تم اپنے بال کٹوا لو تو کیسا رہے گا؟" وہ شوخی سے مسکرا رہا تھا۔ ریشم چونکی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ "کیوں کیا یہ لمبے بال اچھے نہیں لگتے!!"

"لگتے ہیں۔ مگر کٹے ہوئے بال تمہارے حسین چہرے کو جب اپنی سیاہ فریم میں جکڑ لیں گے تو اور ہی بات ہوگی۔" وکاس نے گہری آنکھوں سے اُسے دیکھا تو ریشم کو جیسے اندر سے جھرجھری سی آگئی۔ وہ وکاس کی ان اندر اتر جانے والی نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔ اس کی لانبی لانبی پلکوں سے ڈھکی بادامی آنکھیں جب اپنائیت کا رنگ لیے اس کی اپنی آنکھوں میں اُترتیں تو اترتی ہی چلی جاتیں... وہ کانپ کانپ اٹھتی ...... وکاس نے کہا۔ "بھئی تم اپنی ناک میں کیل پہن لو۔"

دوسرے ہی دن اُس نے ناک چھیدوا کر کیل پہن لی۔ تو وکاس کے چہرے پر رنگوں کی برسات ناچ اُٹھی۔

اور جب وکاس نے اس کی تصویر مکمل کی اور اپنے اسٹوڈیو میں لے جا کر اوپر پڑا ریشمی پردہ اٹھایا تو وہ سن سی رہ گئی تھی۔

"پونم۔!"

ہاں وہ پونم ہی کی تصویر تھی۔

"دیکھا کتنی خوبصورت لگ رہی ہو تم! بالکل چاند کی دلہن کی طرح۔ سچ کہتا ہوں ریشم یہ تصویر اب کے انٹرنیشنل مقابلے میں ضرور پہلا انعام لے گی۔" وہ بولتا رہا۔ اور پیچھے سے اس کے دونوں کندھوں پر اپنی باہیں ٹکائے اس کی ترشی ہوئی زلفوں میں چہرہ چھپانے لگا تو وہ سارے بدلنے

کانپ گئی تھی۔ مگر سنبھل کر اپنے بکھرتے وجود کو سمیٹتے ہوئے مسکرائی تھی۔

"ہاں وکی! بہت خوبصورت تصویر بنائی ہے تم نے۔ ایسا لگتا ہے جیسے پونم زندہ ہو گئی ہو۔
"پونم؟" وہ چونکا۔" ارے ہاں! بھئی واقعی یہ تو پونم ہی کی تصویر لگ رہی ہے" وکاس بظاہر ہنس کر بولا۔ وہ جانتی تھی کہ اس ہنسی کے پردے میں کتنی ٹیسیں اور آنسو دہک رہے ہیں۔!!

"چلو اچھا ہوا۔ یوں پونم کی تصویر بن گئی ورنہ۔ میں تو اسے بھول ہی چکا تھا اور۔ تم؟!"
وہ تیزی سے اس کی جانب مڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اُس نے گھبرا کر پلکیں جھکا لیں اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔" اُسے کوئی کیا بھلا سکے گا۔"

ہاں ریشم! تم ٹھیک کہتی ہو۔ جو پہلا پیار ہو کسی کا۔ جو دل کی وادی میں بہار کا پہلا جھونکا ہو۔ وہ جو سپنوں کا شیتل چاند ہو اور جو انتظار کی دہلیز پر کھڑا درد کی برف اوڑھے سو گیا ہو۔ اُسے۔ کوئی کیا بھلا سکے گا!

ریشم جانتی تھی کہ وکاس پونم کا تھا! پونم کا ہے اور رہے گا۔ پھر بھی اس نے جی جان سے چاہا تھا کہ وہ اس کا بن جائے۔ اتنا اپنا کہ پونم کی یاد بھی اس تک نہ پہنچ سکے۔ اسی لیے وہ وکاس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گئی۔ اس کی ہر خواہش پوری کر دیتی۔ اس نے کہا وہ بال تراش لے۔ اس نے لمبی زلفیں تراش ڈالیں۔ اس نے چاہا کہ وہ ناک میں کیل پہن لے اُس نے کیل پہن لی۔ وکاس چاہتا کہ وہ ہمیشہ سبز لباس پہنا کرے۔ وہ سبزے کی بہار بن گئی۔ وکاس کو جو پسند تھا وہ وہی کرتی۔ تاکہ وکاس پوری طرح اس کا اپنا بن جائے! لیکن یوں وہ اس سے دور ہٹتا گیا۔ پونم سے قریب ہوتا گیا۔ ریشم مرتی گئی۔ پونم زندہ ہوتی گئی۔ ریشم نے آہستہ آہستہ پونم کا روپ رنگ اور پونم کی ادائیں دھار لیں اور پونم جیتی جاگتی ہنستی بولتی وکاس کے سامنے رہنے لگی۔ ریشم دھند میں کھوتی گئی۔ ڈوبتی گئی۔ وہ پونم کا وجود اپنا چکی تھی۔ مگر خود زندہ رہ کر بھی مردہ تھی۔ اس کے اپنے احساسات اور جذبات زندہ تھے۔ وہ انھیں کیسے مار دیتی؟ وہ پونم بن کر نہیں ریشم بن کر وکاس سے محبت کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وکاس بھی ریشم سے پیار کرے۔ ریشم کا بنا رہے۔ مگر۔! وہ وکاس سے کہہ نہ پاتی تھی۔ اسی آگ اسی گھٹن نے اُسے دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیا۔ وہ اندر سے کھوکھلی ہوتی چلی گئی۔ اُس نے لاکھ چاہا کہ وہ یہ سب کچھ بھول کر ان لمحوں کو ابدی بنا لے جو وکاس کی بانہوں میں

مہکتے ہیں ـــــ جو وکاس کے قرب اور اس کی بے پناہ محبتوں کے امین ہیں۔ لیکن ایسا نہیں کر سکی۔ یہ نہیں کہ وکاس اس سے لاپرواہ رہا ہو اُسے چاہتا نہ ہو۔ وہ اسے دل و جان سے عزیز رکھتا ہے۔ کوئی پل اس سے دوری گوارہ نہیں کرتا۔ پروانے کی طرح اس کے گرد منڈلاتا ہے، اس کے ناز اُٹھاتا ہے ـــ اس کی اسی والہانہ محبت نے ریشم کو قطرہ قطرہ زہر پلایا ہے۔ شادی کے ان چار سالوں میں ریشم روز مرتی رہی روز جیتی رہی!!

اُسے اچھی طرح یاد ہے جب پونم کی اتفاقیہ موت ہو گئی ـــ تو وکاس کس طرح ایک لاش سا بن گیا تھا! نہ ہنستا نہ بولتا۔ نہ تصویریں بناتا۔ اسے اپنا ہوش ہی نہیں رہا تھا! گھر پر اور تھا ہی کون جو اس کا خیال رکھتا۔ بوڑھے دادا جی کو جوان پوتی کی موت نے زندہ درگور کر دیا تھا۔ وہ تو بلک بلک کر رونے تھے۔

"ہائے وکاس! میں کب سے تمہارا منتظر تھا کہ کب تم ولایت سے واپس آؤ گے اور کب پونم کا ہاتھ تمہیں سونپ دوں۔ کیا پتہ تھا کہ میری معصوم بچی مجھے یہ داغ دے جائے گی"

اور وکاس آنسو پینے کی کوشش کرنے لگتا تو رگیں ابھر آتیں۔ چہرہ ڈوبتے سورج کی طرح آگ کا گولہ بن جاتا۔ ریشم اندر سے ٹوٹ جایا کرتی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ وکاس کو بہلانے کی کوشش کی۔ وہ کہتا۔ جو ایک بار ٹوٹ کر بکھر چکا ہو اُسے سمیٹنے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہیں کچھ بھی نہ دے سکوں گا۔ میرے دل کی تھالی سونی ہو چکی ہے۔ جو تھا' میں نے پونم کے آنچل میں ڈال دیا تھا"

لیکن وہ تب بھی ہار نہ مان سکی۔ اُس نے وکاس کی زندگی کو اپنی زندگی سمجھ لیا تھا۔ تب آخری وقت میں دادا جی کی خواہش پر وکاس مجبور ہو گیا کہ پونم کی جڑواں بہن ریشم کو اپنا لے۔ جو اُسی کی ہم شکل ہے۔ جیسے پونم کا دوسرا روپ . . . دونوں میں فرق صرف قد و قامت کا تھا۔ وکاس پونم کا منگیتر تھا، پونم کی جگہ ریشم کو اپناتے ہوئے اس کی روح تک کرب کی آگ میں سلگ اٹھی تھی۔ اسے جانے کتنے عذابوں سے گزرنا پڑا تھا ـــ شادی کے بعد بھی کئی دن تک وہ ریشم سے دور بھاگتا رہا، بہانے بنا کر اپنا زیادہ وقت باہر گزارتا . . . اور ریشم اسے

پاکر بھی نہ پا سکی تھی۔ تب ریشم کو پونم کے روپ میں ڈھل جانا پڑا۔۔۔ اپنی شخصیت کو مٹا کر پونم بننا پڑا۔۔۔ تب کہیں جا کر وہ وکاس کا دل جیت سکی۔ اور اس نے وکاس کو پالیا تو ہمہ وقت اک آگ۔۔۔ اک ایسے جہنم میں جلنے لگی جو کسی کو دکھایا نہ جا سکتا تھا۔ ایسی آگ جو اس کے آنسو بھی بجھا نہ پائے!! پھر وہ مسلسل بیمار رہنے لگی۔۔۔ اپنے آپ میں سمٹتی گئی۔۔۔ ڈوبتی گئی۔

وکاس اُسے ہر جگہ لیے پھرتا رہا۔۔۔ ایک ڈاکٹر سے دوسرا ڈاکٹر۔۔۔ دوسرے سے تیسرا بدلتا رہا۔۔۔ لیکن اس کی بیماری ایسی تو نہ تھی کہ ڈاکٹروں کی گرفت میں آتی۔ نہ وہ اچھی ہو سکتی تھی نہ مر سکتی تھی۔ ریشم ہی کی خواہش پر وہ اسے لے کر بمبئی چلا گیا تھا۔ جہاں مسلسل تین ماہ رہا۔۔۔ اُسے ہر طرح خوش رکھنا چاہا۔ کیونکہ ریشم کو اپنی اس پہاڑی کوٹھی میں، باہر وادیوں میں، پہاڑوں پر، ہر جگہ پونم ہی پونم دکھائی دیتی تھی!!

لیکن جیسا کہ وکاس نے شہر جاتے ہوئے کہا تھا "اگر وہاں جا کر بھی وہ یاد آئی تو کیا کریں گے؟" اور ایسی چبھتی آنکھوں سے اُسے دیکھا تھا جیسے کہ وہ نشتر اس کے دل میں اتار رہا ہو— وہ گھبرا کر اپنے گرد شال لپیٹنے لگی تھی۔ تب وکاس اس کے پاس آگیا۔ شال ٹھیک کی اور بانہوں کا سہارا دے کر زینے سے اتارنے لگا تو ریشم پھپک کر رو اُٹھی۔

وکاس کا کہنا سچ نکلا۔ بمبئی کی گہما گہمی۔۔۔ سیر و تفریح۔۔۔ روشنیوں کے سیلاب اور انسانوں کے بے پناہ ہجوم میں بھی اُسے پونم یاد آئی۔ جیسے اس کی روح ریشم کے ساتھ ساتھ چل رہی ہو— آس پاس ہی گھوم رہی ہو۔ اور پھر وہ وہاں سے بھی گھبرا گئی۔

"چلو وکاس! گھر چلیں۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے!"

"مگر ریشمی! وہاں تو تم اور بھی اداس رہو گی۔ وہاں تو یادیں ہی یادیں ہیں"

"اچھا ہے۔۔۔ کم از کم یادوں میں تو گھری رہوں گی۔ یہ چند دن جو بچ گئے ہیں تنہا تو نہ گزریں گے۔" وکاس نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا— ریشم کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"وکاس! رات برف گری تھی نا! میں نے محسوس کیا تھا کہ جیسے پہاڑوں پر ٹھنڈے ٹھنڈے پھول گر رہے ہوں۔"

"نہیں تو! برف کہاں گری؟ یہ تمہارا وہم ہے۔" وہ جھوٹ بول کر ہنسا۔ یوں کہ اس کی

پلکوں پر ستارے چمک اٹھے۔

"وکی! آج مجھے باہر لے چلو۔ جی بہت چاہتا ہے وہاں جانے کو!" وہ کھڑکیوں کی جانب دیکھنے لگی۔

"کہاں؟"

"وہیں! چرچ کے سامنے اس جھیل کے پاس.... جہاں... پو... نم..." وہ رُک گئی۔

"نہیں۔ تم وہاں نہیں جاؤ گی"... وہ سہم گیا "تمہاری طبیعت بھی تو خراب ہے۔"

وہ مسکرانے لگی "تم اگر نہ لے جا سکو تو میں خود چلی جاؤں گی۔ آج دل بہت چاہ رہا ہے۔ ایک بار وہ جگہ دیکھ لوں۔" ریشم کا گلا گھٹ گیا جیسے آنسوؤں کا پھندہ پڑ گیا ہو۔ سرخ شال لپیٹے وہ چمپا کا زرد پھول لگ رہی تھی۔ آوارہ بالوں کی لٹیں چہرے پر بکھر گئی تھیں۔ وکاس کے سامنے ریشم نہیں پونم تھی!۔ پونم۔ اس کی اپنی محبت۔ وہ بہکنے لگا۔

"بولو وکی! لے چلو گے نا؟!"

وہ پونم کی کوئی بات کیسے ٹال سکتا تھا! کھوئے کھوئے انداز میں بولا "ہاں ہاں لے چلیں گے!" اور ریشم عجیب انداز میں مسکرا دی۔

اور وہ شام کو سڑک تک اُسے کار میں لے گیا۔ پھر سہارا دے کر جھیل کے کنارے جہاں ایک بڑی چٹان پڑی تھی۔ وہ وہیں تھک کر بیٹھ گئی۔ شہر سے آئی ہوئی کشتیاں جھیل کے اسی کنارے لگتی تھیں۔ ریشم گرم اونی کوٹ پہنے، سرخ سکارف باندھے ہوئے تھی۔ ہاتھوں میں دستانے تھے۔ وہ چٹان پر بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔ وکاس ذرا فاصلے سے کھڑا تھا۔ تبھی سرد ہوا چلنے لگی۔ وہ قریب آگیا "چلو ریشم! واپس چلیں"

"ابھی نہیں ــ! ابھی تو برف گرے گی۔ میرا دل کہتا ہے! میں نے کب سے برف نہیں دیکھی وکاس۔!!"

"نہیں ڈیر! چلو اب، ورنہ تمہارے مزاج بگڑ جائیں گے۔ شام گہری ہو رہی ہے"

اُس نے کہنا چاہا کہ وہ آج تک اُسے پونم سمجھ کر پیار کرتا آیا ہے۔ وہ اپنے دل کا یہ راز اگل دینا چاہتا تھا مگر ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر ایک بار اُسے کھو بیٹھے۔ تب ہی ریشم نے

کہا۔" وکاس! دنیا میں کئی قسم کے مجرم ہوتے ہیں نا! چور۔ ڈاکو۔ قاتل۔ سب کی سزا الگ الگ ہوتی ہے نا!"

"اب یہ کیا ذکر لے بیٹھی ہو۔ چلو چلیں۔" وہ اُسے بانہوں سے پکڑ کر اٹھانے لگا۔ وہ بیٹھی ہی رہی۔ "نہیں وکی! پہلے میری بات سن لو۔ مجھے کہہ لینے دو!" وکاس حیران کھڑا رہا۔ ریشم کہنے لگی۔ "تو قاتل بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں نا! ایک وہ جو پکڑے جاتے ہیں جن کی سزا موت ہے۔ جو پھانسی پر لٹکا دیے جاتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو قتل کر کے پکڑے نہیں جاتے! —— زندہ رہتے ہیں مگر۔ ہر پل احساس کی جیل میں عذاب سہتے ہیں۔ ہر لحہ پھانسی پر لٹکتے ہیں۔ ایک کرب، ایک اذیت انھیں ناگ کی طرح ڈستی رہتی ہے۔ نہ وہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔ میرا شمار بھی دوسری قسم کے مجرموں میں ہوتا ہے۔"

"کیا بک رہی ہو تم؟!" اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ریشم کا وجود بھی کانپ رہا تھا۔ وکاس نے اُسے سہارا دے رکھا تھا۔

وہ پھر مسکرائی۔ "ہاں وکی! آج بک لینے دو۔ پھر یہ کہانی ختم ہو جائے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جرم کی یہ داستان سنانے سے پہلے ہونٹ بند ہو جائیں۔ میں قاتل ہوں وکی!" وہ آہستہ آہستہ رُک رُک کر بول اٹھی۔ "میں —— قاتل ہوں۔"

"قاتل؟ —کس کی قاتل—؟!" وہ چونکا

"تمھاری۔ اپنی۔ اور۔ اور پونم کی۔"

"نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم پاگل ہو گئی ہو— نہیں!"

شام ڈھل گئی ہے۔ رات کی سیاہ ناگن نے اپنا پھن پھیلا دیا ہے۔ ایک خوفناک سناٹا ہے۔ جھیل سنسان پڑی ہے۔ اور دور سے کسی آنے والی لانچ کے چراغ ٹمٹما رہے ہیں۔

"یہ سب یوں ہوا وکاس کہ— تم میری بہن کے منگیتر تھے! تم اس سے پیار بھی کرتے تھے۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے جیتے تھے۔ تم جب بھی گھر آتے میں تمھیں حسرت سے تکا کرتی تمھاری جاذب شخصیت۔ تمھارا دراز و مضبوط سراپا۔ تمھارا چلنے کا انداز۔ بولنے کا انداز۔ مجھے بہت پسند تھا! اتنا کہ میں تم سے پیار کرنے لگی۔ پونم میری بہن تھی۔ لیکن اب وہ میری رقیب بھی تھی۔" وہ

کہتے کہتے رک گئی۔ سردی اور جذبات کی ملی جلی شدت سے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ اور وکاس جیسے پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔ صرف اس کی سماعت باقی تھی۔ ریشم کی آواز جیسے دور کسی گنبد سے گونجنے لگی۔

"میں چاہتی تھی کہ تم میری طرف متوجہ ہو جاؤ۔ مگر تم نے کبھی میری جانب ایسی نظروں سے نہ دیکھا جن کی میں متلاشی تھی۔ میرے پیار میں روز بروز شدت آتی گئی۔ میں کسی بھی صورت تمہیں پانا چاہتی تھی۔ کسی دوسرے مرد کا تصور بھی میرے لیے بار تھا۔ میں اپنے آپ تمہارے پیار میں ڈوبتی چلی گئی۔ پونم کو میرے جذبات کا علم نہیں تھا۔ تمہیں بھی نہیں تھا۔" اس کی آواز بھرا گئی وہ رکی۔ اور ہانپنے لگی۔ جیسے اتنا کہہ کر بہت تھک گئی ہو۔ جیسے بہت بڑا کام کیا ہو۔ موسم اچانک بدل گیا۔ ہوا کے جھکڑ چلنے لگے ہیں۔ برف گرنے کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ مگر دونوں موسم سے بے خبر اپنی اپنی آگ میں جل رہے تھے۔ وکاس ہر احساس سے عاری بت کی طرح کھڑا تھا۔ ریشم اس کا سہارا لیے بیٹھی رہی۔ اُس نے پھر سنبھل کر کہنا شروع کیا۔

"پھر تم۔ اپنی تصویروں کی نمائش کے لیے لندن چلے گئے۔ تین مہینوں بعد اچانک تمہارے بمبئی پہنچنے کی خبر ملی تو میں خوشی سے دیوانی ہو اٹھی۔ اُس روز پونم اپنی کسی دوست سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ کہہ گئی کہ تمہاری کوئی کال آئے تو میں ریسیو کر لوں۔ وہ تمہاری منتظر تھی!۔ پھر تمہاری کال آئی تم نے کہا کہ تم دوسری شام یہاں پہنچ رہے ہو۔ اور جب پونم واپس آئی تو میں نے بتایا کہ تم آج رات دس گیارہ بجے تک پہنچ رہے ہو۔ اور یہ کہ تم نے اُسے جھیل پر انتظار کرنے کو کہا ہے۔ اور۔ وہ پاگل لڑکی فوراً تمہیں لینے یہاں آگئی۔ اُس شام بھی آندھی کا سماں تھا۔ برف گر رہی تھی۔ اور رات بھر اتنی برف گری کہ سب کچھ ڈھک گیا۔ پونم گھر نہیں لوٹی۔! تم ––– تم دوسری شام گھر آگئے۔ پونم کو پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ تمہارے پروگرام کے باوجود تفریح کے لیے چلی گئی ہے۔ تم انتظار کرتے رہے۔ دادا جی بھی اُسے پوچھتے رہے۔ اور۔ اور تیسرے دن برف کی کھدائی کے بعد اس کی سرد اکڑی ہوئی لاش ملی تھی۔ اسی جھیل کے پاس!۔ میں نے اپنی غرض کے لیے اُسے مار دیا، وکاس! میں اس کی قاتل ہوں۔ مجھے سزا دو۔ مجھے سزا دو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

طوفان کے جھکڑ زور و شور سے چلنے لگے۔ جھیل ایک سیاہ ناگ کی طرح پھنکارنے لگی۔

کالی اور خوفناک رات اپنی سیاہ چادر پھیلا رہی تھی۔ اندھیرا۔ برف۔ طوفان "نہیں!" وکاس کی آواز دور تک سناٹے کا کلیجہ چیرتی ہوئی چلی گئی "نہیں! یہ جھوٹ ہے کہ میری پونم میرے انتظار میں کھڑی کھڑی برف کے تودوں میں چھپ گئی۔ تم نے۔ تم نے اُسے مارا۔ تم نے اُسے قتل کیا؟۔ نہیں ریشم۔ کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے۔ کہانی ہے۔ ریشم! میں نے تمہیں پونم کا دوسرا روپ سمجھ کر پیار کیا۔ پوجا کی اس لیے کہ پونم کی آتما خوش ہو سکے۔ مگر تم۔ تم نے میرے اعتماد کی دھجیاں اُڑا دیں تم نے اس گھر میں آگ لگا دی جو ہم نے تنکے تنکے جوڑ کر بنایا تھا!۔ نہیں۔ نہیں ریشم۔ یہ سچ نہیں ہے"

"یہ سچ ہے وکی! تم۔ تم مجھ سے نفرت کرتے۔ تو اچھا تھا۔ مجھ پر شک کرتے۔ مجھے سزا دیتے، تو مجھے سکون مل جاتا! تم نے یہ سب کچھ نہ کیا۔ صرف پیار کرتے رہے مجھے۔ م۔ مجھے۔ معاف مت۔ کرنا۔ وکی۔ کبھی معاف مت کرنا" اور وہ اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

"ریشم!"۔ وہ اُس کے بے جان جسم سے لپٹ کر پھوٹ پڑا

دوسری صبح لوگوں نے دیکھا کہ دو جسم ایک دوسرے کی بانہوں میں برف کے پھولوں میں ڈھکے پڑے ہیں!!۔

OO